

رئیس العلماء نمبر

مدیر

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسفند جاہلی

نائب مدیر

ڈاکٹر عارف عباس، لکھنؤ

نور ہدایت فاؤنڈیشن



امام باڑہ غفران مآب، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ-۳ (یو۔ پی) انڈیا

ISSN 2456-8384

RAEES-UL-ULAMA NUMBER



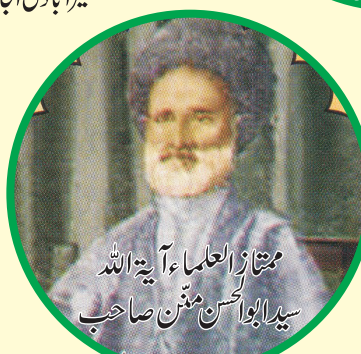
رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی رحمہ اللہ



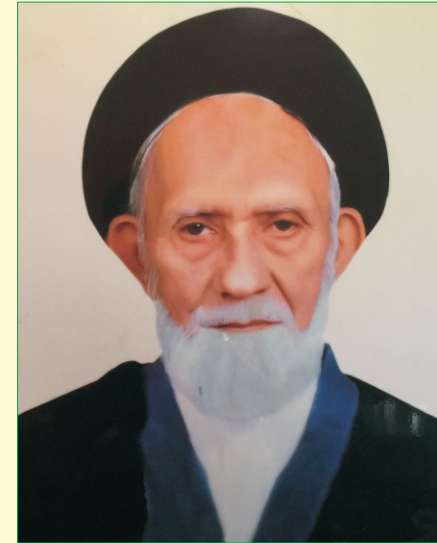
NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION

Imambara Ghufuran Maab, Chowk LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA

Phone : 0522-2252230



آیۃ اللہ العظمیٰ سید ولد دار علی غفران مآب
نصیر آبادی الجاہلی ابن سید محمد معین



رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی رحمہ اللہ



علامہ علی محمد نقوی علی گڑھ



صدر العلماء آیۃ اللہ سید باقر نقوی مہدی



سید عباس علی نقوی مہتمم امریکہ

بسمہ سبحانہ

(سلسلہ اشاعت نور ہدایت فاؤنڈیشن نمبر- ۳۳)

ممتاز ادیب و مصنف رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی کی یاد میں
اُن کے چالیسویں کے موقع پر یادگاری مجلہ

رئیس العلماء نمبر

تاریخ اشاعت: ۱۸ مارچ ۲۰۱۸ء (اتوار)

مدیر

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جاسی

نائب مدیر

ڈاکٹر عارف عباس، لکھنؤ

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن، امام باڑہ غفران مآب، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ۔ ۳ (یو۔ پی) انڈیا

E-mail: noorehidayat@gmail.com

Website: noorehidayatfoundation.org

Phone: 0522-2252230, 08736009814, 09335996808

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جاسی	۳
۲	خلاصہ سفر زندگی	بنت زہرا نقوی ندی الہندی مؤسسہ نور ہدایت لکھنؤ	۵
۳	غفران مآب علیہ الرحمہ سے رئیس العلماء تک	ڈاکٹر عارف عباس، لکھنؤ	۷
۴	شعبہ شیعہ دینیات اے ایم یو کا خورشید ضو بار	اصغر اعجاز قائمی، شعبہ دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۱
۵	آہ! آیت اللہ سید کاظم نقویؒ	پروفیسر شاہ محمد وسیم صاحب، علی گڑھ	۱۴
۶	قطعات بیاد رئیس العلماءؒ	تنویر نگروری، لکھنؤ	۱۶
۷	نظم/ رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقویؒ	سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جاسی	۱۷
۸	نظم	اصغر اعجاز قائمی، شعبہ دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۸
۹	قطعہ تاریخ	مولانا سید محمد رضا ساجد رضوی ساجد زید پوری، لکھنؤ	۱۸
۱۰	اسلام کی ضرورت	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۱۹
۱۱	اسلام کیا چاہتا ہے	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۲۸
۱۲	وہ تھے غلام کاظمؒ	بنت زہرا نقوی ندی الہندی، لکھنؤ	۴۶
۱۳	عرب کے اقتصادیات اور اسلام کے خدمات	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۴۷
۱۴	دنیا دین کی نظر میں	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۵۶
۱۵	یثرب کا مسافر سرزمین کربلا پر	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۶۴
۱۶	ایام عزاکا اختتام اور اپنے نفوس کا جائزہ	رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ	۶۹
۱۷	نظم/ رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقویؒ	م۔ر۔ عابد، گولڈن گنج، لکھنؤ	۷۱
۱۸	قطعہ/ آیت اللہ سید کاظم نقویؒ کی یاد میں	قائم مہدی نقوی تذبیب نگروری، لکھنؤ	۷۱

صفحہ ذہن پر جو ہے موجود لکھے دیتا ہوں اُس کو کاغذ پر

خاندانِ اجتہاد نے اپنی انفرادیت کے امتیازی نشان تاریخ کے سپرد کئے ہیں یہ نشان ایک دو نہیں، بہت ہیں۔ ان میں ایک علم اور دین کی راہ میں قابلِ قدر و اعتبار خدمات بھی ہیں۔ اسی ضمن میں تعلیمی خدمات اور کارنامے ہیں۔ خود حضرت غفران مآب نے مدرسہ علم و اجتہاد قائم کر کے ان خدمات کی بنیاد رکھی اور اپنی تمنتائے ابراہیمی والی دعاؤں کے زیر سایہ اپنی کل کی کل اولاد کو براہِ راست تعلیم و تربیت دے کر علمی کاروان کو تیار کر دیا۔ خاندان کی اجتہاد کی صورت میں بھی ابھر کر اس تعلیمی کاروان نے اپنے (طبعی، طبعی/جہلی) خاصہ کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ یہاں تک کہ علم و تعلیم کے سلسلے کی کوئی بھی تحریک ایسی نہ ملے گی جس کا سرا اس خاندان، اس تعلیمی کارواں سے نہ ملے۔

غفران مآب علیہ الرحمہ نے جس وسیع اور عریض جگہ پر ہندوستان کا پہلا مدرسہ فقہ و اجتہاد قائم کیا تھا اُسے اب حسینہ غفران مآب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مدرسہ غفران مآب کی توسیع کی صورت میں سلطان العلماء کے زیر نظر سید العلماء کی تحریک پر شاہی سرپرستی میں مدرسہ سلطانی کی تاسیس ہوئی جس کی عمارتیں اس وقت کے مقبرہ سعاد علی خاں اور آصفی امباڑہ تھے شاید ایسا حوزہ علمیہ اس وقت دنیا میں نہیں تھا جو ۱۸۵۷ء میں انگریز آسیب کا شکار ہو کر تعطلی کا شکار رہنے کے بعد اپنی نشاۃ ثانیہ میں سلطان المدارس و جامعہ سلطانیہ کی شکل میں نمودار ہوا جس کے پہلے پرنسپل باقر العلوم کے والد ماجد سید ابوالحسن صاحب بنائے گئے۔ مدرسہ سلطانی کے تعطل پر ممتاز العلماء جنت مآب کی سرپرستی میں لکھنؤ میں مدرسہ ایمانیہ حسینہ جنت مآب اور حسینہ زبدۃ العلماء مولانا سید علی نقی میں قائم ہوا جس کے پرنسپل مولانا سید ابوالحسن صاحب بنائے گئے۔ بعد میں علامہ کنھوری نے بھی اس مدرسہ کو بہتر بنانے میں کافی محنت کی اور اس کے فروع کی صورت میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں رؤساء کی کمک سے مدرسہ ایمانیہ قائم کئے جن میں آج چند مدرسے باقی ہیں۔ ایسے ہی مولانا ابوالحسن صاحب کی تحریک سے مدرسہ ناظمیہ قائم ہوا جس کے پرنسپل نجم الملک مولانا نجم الحسن صاحب ہوئے۔ دوسری طرف راجہ محمود آباد کی مالی کمک سے ملاذ العلماء سید ابوالحسن اور بحر العلوم سید محمد حسین علقن کی سرپرستی میں مدرسہ اسلامیہ قائم ہوا جو اب اسلامیہ کالج کی صورت میں موجود ہے۔

خاندانِ مفتی محمد قلی کے چشم و چراغ اور خاندانِ اجتہاد کے داماد جسٹس علامہ سید کرامت حسین نے اسلامیہ گریس اسکول قائم کیا جو شاید ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان لڑکیوں کا پہلا اسکول تھا۔ جس میں مدرسے کی بھی ساری تعلیم ہوتی تھی۔ اب وہ کرامت حسین ڈگری کالج کی صورت میں موجود ہے۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے بانی قدوة العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب نے شیعہ کانفرنس کے تحت رؤساء کی مدد سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں چھوٹے چھوٹے مدرسے اور اسکول کھولے تھے۔ مگر خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن فاطر جائسی کے اصرار پر قدوة العلماء نے علماء و رؤساء کی مدد سے شیعہ کالج لکھنؤ کی بنارکھی۔ افسوس ہے کہ وہ اب تک کالج ہی رہا۔

علماء و فقہاء خاندانِ اجتہاد دوسرے خدمات کے علاوہ سب ہی تدریس سے بھی جڑے رہے۔ مدرسہ غفران مآب سے چل کر مدرسہ سلطانی،

اس موضوع پر ادارہ میں مزید لکھنا ممکن نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہی لے لیجئے۔ اس کی بیحد علماء نے مخالفت کی لیکن خاندانِ اجتہاد اس کا زبان و قلم سے حامی رہا بلکہ خاندانِ اجتہاد کے ایک بڑے عالم جن کی سیکڑوں کتابیں عربی، فارسی اور خالص اردو میں ہیں یعنی تاج العلماء سید علی محمد نقوی اس کے ٹرسٹیان میں رہے۔ انہیں کی مشورت سے تھیا لوجی ڈیپارٹمنٹ میں سنی اور شیعہ دینیات کے شعبے الگ الگ قائم ہوئے تھے بلکہ پہلے استاد کا تقرر انہی کے بھیجے ہوئے عالم کا ہوا تھا۔ ایک زمانہ کے بعد اس شعبہ میں مشہور زمانہ عالم سید العلماء مولانا سید علی نقوی صاحب کو یونیورسٹی کی جانب سے تدریس کے لئے مدعو کیا گیا۔ یہ بات اس شعبہ کے افتخار کے لئے تاقیامت کافی ہے کہ سید العلماء استاد رہے۔ سید العلماء کے بعد صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی صاحب پھر رئیس العلماء سید کاظم نقوی صاحب کچھ عرصے بعد علامہ سید علی محمد نقوی صاحب کا سیدھے پروفیسر ہونا پھر قائد ملت مولانا سید کلب جو ان نقوی صاحب کا پروفیسر ہونا یہ خاندانِ اجتہاد کے تدریسی نظام ہی کا حصہ ہے۔ آج ہم جس کے نام سے یہ رسالہ منسوب کر رہے ہیں وہ بھی تعلیم و تدریس و تصنیف کو لیکر عدیم المثل ہستی تھی۔

نور ہدایت فاؤنڈیشن کی اشاعت رئیس العلماء نمبر کی صورت میں خاص نمبر ہے اور اہل علم و ذوق کو پیش ہے موصوف و اتقی صدر بزمِ اجتہاد، ضیائے صدق و سداد، یادگار سید العلماء و ممتاز العلماء، افتخارِ خاندان، فخرِ اسلاف و اخلاف، نازش جائس و نصیر آباد و لکھنؤ، جلوہ فزائے دارالعلوم علی گڑھ، خسر و علم و قلم، شانِ مسند فقہ و تفقہ و تصنیف، گوشہ نشین و نمائش گریز، مالک عز و وقار، صاحب علو و افتخار، فاضلِ تبحر تھے۔ افسوس ہے کہ آج رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقویؒ ہمارے درمیان نہیں رہے سرفراز مغفرت اپنے جنت الفردوس کے مکانِ عالیشان میں جلوہ فزا ہو گئے۔ رحمت و فضل حق سے اپنے معصوم مولاؤں کے جوار میں پہنچ گئے۔ ہم سب اہل جائس، اہل نصیر آباد، اہل لکھنؤ و اہل علی گڑھ غزودہ و سوگوار ہیں کہ کیسے دریتیم کو ہم نے گنوا دیا۔

”مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں۔“

انہوں نے لکھنؤ کی فضائے ناقدری اور علمِ ناشناسی کے ماحول کو بھانپ کر اپنا مرکز علم و قلم علی گڑھ کو بنایا۔ علی گڑھ ابھی بھی ہندوستان میں علم و تعلیم و تعلم میں نمایان و سر بلند بلکہ اول ہے۔ یہ تشنگانِ علم و تحقیق کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ اس کے سرچشمہ فیضان سے خاص و عام کسب فیض کرتے ہیں۔ اچھا ہے یہ زمانہ ابھی انہیں ناقدری کے عمیق نشیب میں کر دے لیکن آنے والی صدیاں شنآوری کے ایسے یادگار گوہر آبدار کو تاریخِ دانشوری میں تابان و فروزاں کریں گی اور ہماری علمی ناقدری کا مرثیہ لکھیں گی۔

موجودہ شمارہ بوجہ انتہائی عجلت میں ترتیب دیا گیا ہے اور اسے جلدی سے اشاعت کے مرحلوں کے سپرد کیا گیا۔ اس میں کوتاہیوں کا درآنا تعجب کی بات نہ ہوگی۔ خیر اب یہ بفضلِ رب العزت آپ کے بلند ذوق کو نذر ہے۔ امید ہے کہ ہماری کوتاہیوں کو درگزر کرتے ہوئے ہمیں اور خاص طور سے اس شمارے کی ترتیب و تدوین و تزئین و طباعت و اشاعت اور تصنیف کے کارپردازوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے اور خصوصی شمارہ کی پذیرائی کرتے ہوئے مقبولیت عام سے ہمکنار کریں گے۔

والسلام

سید مصطفیٰ حسین نقوی سیفِ جائس

۱۴ / مارچ ۲۰۱۸ء

خلاصہ سفر زندگی

بنت زہرا نقوی ندی الہندی مؤسسہ نور ہدایت لکھنؤ

نام	:	سید کاظم نقوی
القاب	:	رئیس العلماء - آیۃ اللہ
ولادت	:	۲۴ اگست ۱۹۳۴ء مطابق --- ۱۳۵۳ھ لکھنؤ
اسم پدر	:	ممتاز العلماء آیۃ اللہ سید ابوالحسن نقوی مثنیٰ صاحب (پرنسپل مدرسۃ الودعظین لکھنؤ)
اسم مادر	:	سیدہ امۃ الحسین بنت ابوالفضل العباس نصیر آبادی
اسم برادران	:	(۱) آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقوی عالم (۲) علم الہدیٰ آیۃ اللہ سید مرتضیٰ نقوی (۳) آیۃ اللہ سید باقر نقوی مقیم دہلی، مدظلہ الشریف (۴) مولانا سید عبدالحسن نقوی
اسم زوجہ	:	سیدہ محمودہ بیگم بنت مولوی سید اعظم علی نقوی جاسی ایڈووکیٹ (متوفیہ ۳۰ مئی ۲۰۱۴ء)
اسم فرزند	:	سید عباس علی نقوی مقیم امریکہ (متولد بہ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء)
خاندان	:	خاندان اجتہاد لکھنؤ
بانی خاندان اجتہاد	:	مجدد الشریعہ، محی الملتہ آیۃ اللہ العظمیٰ سید دلدار علی غفران مآب
تعلیم	:	صاحب اجتہاد
مناصب	:	(۱) امام جمعہ مسجد جامع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی (۳) صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی (۴) ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی

اساتذہ

- (۱) حجتہ الاسلام علامہ سید کاظم حسین نقویؒ (۲) آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی نقویؒ
 (۳) مفتی اعظم آیۃ اللہ العظمیٰ سید احمد علی موسویؒ (۴) آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم الخویؒ
 (۵) آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی بہشتیؒ (۶) آیۃ اللہ العظمیٰ سید مرتضیٰ خلیلیؒ
 (۷) آیۃ اللہ العظمیٰ محمد تقی خوانساریؒ

تلامذہ

- (۱) عالیجناب خضیر موسیٰ جعفر (نائب صدر عراق) (۲) پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
 (۳) ڈاکٹر نسیم زہرا لکچر شعبۂ تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۴) پروفیسر فرمان حسین سابق ڈین شعبۂ دینیات مسلم
 یونیورسٹی (۵) ڈاکٹر رانی بانو اسسٹنٹ پروفیسر و مین کالج مسلم یونیورسٹی (۶) علامہ حامد علی شاہ، پاکستان (۷) علامہ
 حشم حسین، پاکستان۔ آپ کے بیشتر تلامذہ ایران اور عراق میں ہیں جن کے نام نہیں مل سکے۔

تصانیف

- (۱) درس حکومت (۲) اسلام کی ضرورت (۳) اسلام اور طبقاتی نظام (۴) مذہب، اطمینانِ نفس کا سرمایہ (۵) اسلام کیا
 چاہتا ہے (۶) عورت اور اسلام (۷) مادہ، قدیم یا حادث (۸) یثرب کا مسافر سرزمینِ کربلا پر (۹) مذہب اور ضمیر (۱۰)
 اسلام اور آزادی (۱۱) مذہب اور زندگی (۱۲) حضرت علیؑ کا نقطہ نظر اور طریقہ کار (۱۳) وحی ایک پراسرار رابطہ (۱۴) شق القمر
 (۱۵) قانون ساز کون۔ انسان یا خدا (۱۶) عرب کے اقتصادیات اور اسلام کے خدمات (۱۷) دنیا، دین کی نظر میں (۱۸)
 جہالت، بیماری اور تنگدستی (۱۹) حسین اور انسانیت (۲۰) ایامِ عزاء کا اختتام اور اپنے نفوس کا جائزہ (۲۱) من و اہرمن۔
 (مطبوعہ دینیات فیکلٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مارچ ۱۹۸۹ء)

غیر مطبوعہ تصانیف

- (۱) حاشیہ قوانین الاصول (۲) حاشیہ رسائل (۳) شرح رسائل (اردو) (۴) شرح کافی (۵) شرح فرائد الاصول (۶)
 شرح معالم الاصول (۷) شرح مکاسب (اردو) (۸) انجام کائنات (۹) کشکول (۱۰) فقہ اسلامی کے اصول تحقیق

وفات : ۳ جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۰ فروری ۲۰۱۸ء سہ شنبہ ۱ بجے دن کو

بہ مقام شریعت کدہ رئیس العلماءؒ

تدفین : ۲۰ فروری کو ۱ بجے شب میں بہ مقام کربلائے شاہ جمال علی گڑھ

غفران مآب علیہ الرحمہ سے رئیس العلماء تک۔۔۔ مختصر تعارف

ڈاکٹر عارف عباس لکھنؤ

میں پیش کیا ساتھ ہی عزائے امام حسین علیہ السلام کو حقیقی و شرعی دائرہ میں لا کر کافی وسعت دی جس کے نتیجے میں اس عظیم ملک میں شیعیت کو بید ترقی ہوئی۔ یعنی خاندان کے خاندان اور علاقہ کے علاقہ شیعہ ہو گئے۔ مگر اتحاد کی فضا بھی سازگار رکھی۔ یہاں تک کہ شیعہ طلاب معقولات پڑھنے فرنگی محل جاتے تھے اور سنی طلبہ ادب پڑھنے امامباڑہ غفران مآب اور سلطان العلماء سید العلماء کے عہد میں مدرسہ سلطانی آتے تھے نتیجتاً شیعہ اور سنی شیر و شکر رہے اور عزاداری کافی حد تک سبھی مسلمان، غفران مآب کے حسب احکام کرنے لگے۔

نواب و نواب زادگان و راجگان و حکام نیز عوام شریعت کے پابند ہوئے۔ بدعات کا قلع قمع ہوا۔

غفران مآب ایران و عراق میں منبر پر غیر علماء کی نشست سے نالاں تھے۔ لہذا انہوں نے ہندوستان میں خود بھی ذاکری شروع کی اور بیشتر علماء کو ذاکری کے لئے تیار کیا۔

آپ نے بیشتر علوم میں درس دینے کے ساتھ مباحثے اور مناظرے کئے۔ امامباڑے، مسجدیں،

آیۃ اللہ العظمی سید دلد دار علی غفران مآب نصیر آبادی الجاسی ابن سید محمد معین آپ شریعت کے مجدد، ملت کے مچی۔ برصغیر کے پہلے مجتہد جامع الشرائط اور مرجع تقلید، نیز ہندوستان میں شیعوں کی نماز جمعہ و جماعت کے بانی۔ مذکورہ دونوں باتوں کی گواہی کے لئے سیکڑوں مستند علماء کے بیانات اور کتابیں موجود ہیں لیکن حضرت غفران مآب کے شاگرد رشید اور علامہ میر حامد حسین صاحب کے والد ماجد نیز ناصر المملۃ آیۃ اللہ سید ناصر حسین صاحب کے دادا علامہ مفتی محمد قلی کی معرکہ الارا تصنیف ”احکام عدالت علویہ“ خصوصاً اہم ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ میرے استاد ہندوستان کے پہلے مجتہد اور پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے نماز جمعہ اور نماز جماعت کی بنا رکھی۔

غفران مآب ہندوستان کے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے شیعوں کو اخبارات اور صوفیت سے نجات دلائی نیز برصغیر میں دبستان فقہ واجتہاد کی تاسیس کر کے تاریخ ہند میں عظیم کارنامہ انجام دیا۔

آپ نے شیعوں کو ہند میں ایک قوم کی صورت

مدرسے، سرائیں اور کنوئیں بنوائے۔ جگہ جگہ راستوں میں سائے کے لئے درخت لگوائے۔

ہندوستان کے علاوہ عراق و ایران میں علماء و طلاب کو مالی مدد پہنچائی۔ روضوں کی تعمیر و تزئین میں حصہ لیا۔ نہر آصفی کھدوائی جس کی وجہ سے نجف میں پانی پہنچا جس کے نتیجے میں نجف ایک شہر کی صورت میں نظر آیا۔

آپ نے تاریخ ساز کتابیں لکھیں اور شہرہ آفاق شاگرد تیار کئے۔

کچھ کو اجازت اجتہاد و روایت دیا اور بہت سے شاگردوں کو مختصر تعلیم کے بعد اجازت پیشمنازی دے کر اُس وقت کے وسیع ہند میں ترویج عز و تبلیغ دین کے لیے بھیج دیا۔ خاندان اجتہاد تو، غیر منقسم ہند میں غفران مآب کا خانوادہ رہا۔ باقی غفران مآب و آل غفران مآب کے تلامذہ کے علمی خانوادے اپنے اپنے بزرگوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہت سے خانوادے جو علمی صورت میں عظمت کے حامل نہیں رہے مگر ان میں علماء کا تسلسل رہا تو وہ خاندان پیشماز یا پیشماز کا خاندان مشہور ہوئے۔ (غفران مآب پر تفصیل سے جاننے کے لئے آئینہ حق نما مطبوعہ کتاب شناسی شیعہ قم ایران کا مطالعہ ضروری ہے۔)

حضرت غفران مآب کے پانچویں بیٹے عالم اور پانچویں بیٹیاں عالمہ ہوئیں۔ بیٹے پانچویں مجتہد تھے یعنی

آیۃ اللہ لیکن دو بیٹے یعنی سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے مجتہد جامع الشرائط و مرجع تقلید ہوئے یعنی آیۃ اللہ العظمیٰ سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب (جنہیں عوام بڑے قبلہ و کعبہ کہتی تھی حکومت کے حکم سے) آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید حسین علیہین مکان (جنہیں عوام حکومت کے حکم سے چھوٹے قبلہ و کعبہ کہتی تھی)۔

دونوں بھائیوں نے عراق و ایران کی مالی کمک کو اپنے والد سے کہیں زیادہ بڑھا دیا ساتھ ہی روضوں کی تعمیر و تزئین کا کام بجد ترقی پر رہا۔

نواب امجد علی شاہ کے عہد میں سلطان العلماء کی تبلیغ و تدبیر سے حکومت شریعہ قائم ہوئی۔ ان حالات میں علمی و عملی صورت میں جو کچھ ہونا چاہئے تھا سب کچھ ہوا جس کے جاننے کے لئے معتبر تاریخی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

دنیا کے علماء دو گروہوں میں بٹ کر انہیں دونوں بھائیوں کو اعلم مان رہے تھے۔ غفران مآب کے دوسرے بیٹے سید المفسرین آیۃ اللہ سید علی نے متعدد کتابیں لکھیں لیکن اردو زبان کی دنیا میں بین المذاہب پہلی تفسیر ”توضیح المجید“ لکھی جسے تفسیر زبر و مدینہ بھی کہتے ہیں یہ سات جلدوں میں ہے اور مطبوع ہے۔

آپ کے تیسرے بیٹے آیۃ اللہ سید حسن نے کئی کتابوں کے علاوہ اردو دنیا میں شیعوں کی علم کلام میں پہلی

کتاب ”باقیات الصالحات“ تصنیف کی۔

غفران مآب کے چوتھے بیٹے آیۃ اللہ سید مہدی جو آپ کے بھائیوں پر علمی حیثیت سے تفوق رکھتے تھے۔ جوانی ہی میں ایک صغیر الحسن بچہ چھوڑ کر اپنے باپ کو داغ مفارقت دے گئے۔ غفران مآب باقی زندگی سید مہدی پر گریہ کرتے رہے مگر فرزند کی یاد میں معتبر مصائب کی کتاب ”مسکن القلوب عند فقد المحبوب“ لکھ کر بیٹے کے ایصالِ ثواب کا ہمیشہ کے لئے عمل انجام دے دیا۔

غفران مآب کے سب سے چھوٹے بیٹے سید العلماء سید حسین نے سلطان العلماء کی طرح بہت سی تاریخ ساز کتابیں لکھیں اور مشہور زمانہ شاگرد چھوڑے جن میں ایک آیۃ اللہ علامہ مفتی محمد عباس صاحب ہیں جنہوں نے اپنے استاد کے کئی سوانحی تذکرے لکھے جن میں اوراق الذہب (مطبوعہ کتاب شناسی شیعہ۔ قم، ایران) بہت مشہور ہے۔ مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں کم ہی ایسی کتابیں لکھی ہوں گی جن میں اپنے استاد کے قصیدے نہ پڑھے ہوں۔

سلطان العلماء سید محمد کے بعد سید العلماء سید حسین کے بیٹے آیۃ اللہ العظمیٰ ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی جنت مآب علم مانے گئے۔ آپ کے علمی و عملی آثار بہت سے ہیں جن میں خاص حسینینہ جنت مآب اور کتب خانہ ممتاز العلماء ساتھ ہی عربی میں تفسیر اور بہت سی کتابیں

جو مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ آپ نے بھی معیاری کتابوں کے علاوہ نامور تلامیذ، چھوڑے جن میں ایک علامہ میر حامد حسین صاحبِ عبقات بھی ہیں۔ صاحبِ عبقات کی علمی و عملی ترقی میں ویسے ہی ممتاز العلماء کا بڑا ہاتھ ہے جیسے ان کے والد ماجد کی کامیابی میں ان کے استاد حضرت غفران مآب کا کلیدی رول رہا ہے۔ اس بات کو ان مکاتیب سے سمجھا جاسکتا ہے جو (۱) ورثۃ الانبیاء (۲) آئینہ حق نما (۳) اوراق الذہب مطبوعات کتاب شناسی شیعہ، قم میں شائع ہوئے ہیں۔

مفتی محمد عباس صاحب نے اوراق الذہب میں جنت مآب کے لیے لکھا ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں اور علم و فضل میں مجھ سے بڑے ہیں اور اپنے دیوان رطب العرب میں مشاہیر علماء میں اعلیٰ لکھا ہے۔

جنت مآب کے بعد ان کے فرزند آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء محمد ابراہیم فردوس مکان مرجع تقلید ہوئے۔ آپ نے بھی متعدد کتابوں کے علاوہ عربی میں تفسیر لکھی۔ اپنے والد کی طرح بہت سے سماجی امور انجام دیئے۔ انگریزوں سے آصفی امامباڑہ اور مسجد و انزار کروائی۔ ہندوستان میں اذان میں ”وَحَلِیْقَتُهُ بِلَا فَضْل“ مقدمہ جیت کر رائج کروایا جس کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطیب اکبر لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین شاعر اجتہادی اپنے تصنیف

کردہ ایک مریضے میں فرماتے ہیں۔

ڈیڑھ سو سال سے یکساں شرافشاں ہے یہ باغ
بزم و ساقی تو بدلتے رہے بدلا نہ ایام
نہ دبے اپنے پرایوں سے کبھی اپنے دماغ
روشنی لیتے رہے میرے چراغوں سے چراغ

یہ بھی کہہ دوں کہ شرف میرا رہے گا کب تک
آئے آوازِ بلا فصل اذال میں جب تک
سید العلماء سید محمد ابراہیم کی ایک بیوی سے
زین العلماء آیۃ اللہ سید محمد تقی اور دوسرے ممتاز العلماء
آیۃ اللہ سید ابوالحسن ”ممتن صاحب“ ہوئے۔ مولانا
ابوالحسن صاحب کی پہلی زوجہ سے نابغہ روزگار اور مشہور
زمانہ دانشور آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی
ہوئے جو تقریباً تین سو سے زیادہ عربی فارسی اور اردو میں
معیاری کتابوں نیز کئی سوانحی کتابچوں کے مصنف ہیں
اور ابوالحسن صاحب کی دوسری زوجہ سے (۱) آیۃ اللہ سید
مرتضیٰ رحمہ اللہ (۲) آیۃ اللہ سید کاظم نقوی رحمہ اللہ اور آیۃ اللہ
سید باقر نقوی مہتمم دینی ہوئے۔

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی چھوٹے ہی
تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سید العلماء نے اپنے
سارے بھائیوں کی سرپرستی کی جس کے نتیجے میں
سارے بھائی علماء میں محسوب ہوئے۔ سید العلماء کے
بعد ان کے بھائی کاظم نقوی صاحب اور ان کے فرزند

علامہ سید علی محمد نقوی ہی ہیں جنہوں نے اس تحقیقی و تصنیفی
سلسلہ کو قائم رکھا۔ سید العلماء کے بعد علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے صدر صفوۃ العلماء حجتہ
الاسلام مولانا سید کلب عابد صاحب رحمت مآب ہوئے
ان کے بعد مسند نشین صدارت رئیس العلماء ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی سے آپ کی ایک ضخیم کتاب ”من و
اہر من“ شائع ہوئی اس کے علاوہ آپ کے بہت
سے کتابچے سید العلماء کے امامیہ مشن اور ادارہ علمیہ لکھنؤ
سے شائع ہوئے ہیں۔ غیر مطبوعہ مقالات و کتب پر ایک
پوری فہرست ہے جن میں خاص کتابیں۔ (۱) شرح
فرائد الاصول (۲) شرح معالم الاصول (۳) شرح
مکاسب اور (۴) شرح رسائل بہت اہم ہیں۔

افسوس ہے کہ ایسا صاحب علم و تقویٰ، اربجے دن
میں، ۲۰ فروری ۲۰۱۸ء کو رحلت فرما کر کر بلائے شاہ
جمال علی گڑھ میں اربجے رات کو سپرد خاک ہو گیا۔

خداوند عالم مولانا نے موصوف کے فرزند ارجمند
سید عباس علی نقوی مہتمم امریکہ، بھائی صدر العلماء آیۃ اللہ
سید باقر نقوی مہتمم دینی اور بھتیجے پروفیسر علامہ سید علی محمد
نقوی علی گڑھ اور دیگر اعزاء کو صبر جمیل عطا فرمائے اور سبھی
کو رئیس العلماء کے تصانیف و تراجم و شروح کو جلد سے
جلد شائع کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔



شعبہ شیعہ دینیات اے ایم یو کا خورشید ضو بار

اصغر اعجاز قاسمی شعبہ دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

غفران مآبؒ نے ۲۷/رجب المرجب ۱۴۰۰ھ میں لکھنؤ میں پہلی نماز جمعہ کا قیام فرمایا اور پھر اس کے بعد جماعت کا سلسلہ قائم ہو گیا جو آج بھی بدستور جاری ہے۔ حضرت آیہ اللہ سید کاظم نقوی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ممتاز العلماء آیہ اللہ سید ابوالحسن نقوی کے گہوارہ تربیت میں پرورش اور ان سے فیوض و برکات کی تحصیل کے بعد ہندوستان کی عظیم درسگاہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے ممتاز الا فضل کی سند حاصل کی چونکہ دل میں مزید تحصیل علم کا جذبہ کروٹیں لے رہا تھا اس لئے ۱۹۵۴ء میں عالمی دانشگاه حوزہ علمیہ نجف اشرف میں وارد ہوئے جہاں اساطین فقہ و اصول سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نجف اشرف علماء و فقہاء کے وجود سے چھلک رہا تھا۔ فقہ و اصول، تفسیر و حدیث اور عقائد و کلام کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کے ماہرین کے سلسلہ درس جاری تھے۔ آیہ اللہ کاظم نقوی نجف پہنچتے ہیں بہت جلد اجتہاد کی منزلوں سے قریب ہوتے گئے اور پانچ سال کے مختصر قیام کے دوران آیہ اللہ اعظمی خوانساری، آیہ اللہ اعظمی مشہدی اور

مجدد شریعت آیہ اللہ اعظمی حضرت غفران مآب کا خاندان ہند و پاک میں خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے حضرت غفران مآب علامہ سید دلدار علی طاب ثراہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے سلسلہ فقہاء و مجتہدین کی بنا ڈالی تھی ان کی نسل میں ہر دور میں علماء و فقہاء اور مجتہدین کا وجود رہا ہے جنہوں نے اپنے قوت علمی، فکری استعداد اور شرعی فریضہ کی بنیاد پر زبان و قلم دونوں سے مذہب امامیہ کا دفاع کیا ہے اگر ایک طرف اس خاندان نے اپنے زبان و بیان کے ذریعہ قوم و ملت کو عقائد و مسلمات سے روشناس کرایا ہے تو دوسری طرف عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا ہے اور براہین و استدلال نیز قرآن و حدیث کے تناظر میں شریعت حقہ کی حقیقت اور اس کی واقعیت سے پردہ اٹھایا ہے ساتھ ہی ساتھ مذہب تشیع کی قیادت کے ساتھ ساتھ عزاداری کے فروغ اور اس کی اہمیت کے سلسلے میں نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ سرزمین ہندوستان پر پہلی نماز جمعہ و جماعت کے انعقاد کا سہرا بھی اسی خاندان کے سر پر ہے کیونکہ مجدد شریعت حضرت

آیۃ اللہ العظمیٰ ابوالقاسم الخوئی کے دروس خارج سے فیضیاب ہو کر سند اجتہاد حاصل کی ان کی فراست و ذہانت کا یہ عالم تھا کہ یکے بعد دیگرے بڑی سرعت کے ساتھ علوم و فنون سے فیضیاب ہوتے رہے ان کی سعی و کوشش اور جدوجہد کو دیکھ کر اساتذہ کو رشک ہوتا تھا حوزہ علمیہ نجف اشرف سے سند اجتہاد لے کر وہ ہندوستان واپس ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں حوزہ علمیہ قم کے علمی ماحول میں دین مبین کی خدمت کرنے کے لئے تشریف لے گئے جہاں تقریباً ۱۵ سال تک قیام فرمایا اس پندرہ سال کے قیام کے دوران انہوں نے وہاں دروس بھی دیئے لیکن زیادہ تر اپنا قیمتی وقت قلمی نگارش میں صرف کیا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ درس اجتہاد میں شامل کتابیں جن کا اردو زبان میں ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا تھا اسے اردو زبان میں منتقل کیا یہی نصاب اجتہاد کی وہ کتابیں تھیں جن کی شرح و تشریح وہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک کرتے رہے ان کتابوں میں رسائل و مکاسب کی شرح بے انتہا عظمت کی حامل ہے جو ابھی مخطوطہ ہے انشاء اللہ ان کے فرزند سید عباس علی نقوی مقیم امریکہ انہیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں دعا ہے یہ کتابیں جلد از جلد شائع ہو کر منصفہ شہود پر آئیں تاکہ ہندو پاک کے مدارس میں دینی طلباء کو ان سے فیضیاب ہونے کا موقع میسر ہو سکے۔

حوزہ علمیہ قم سے واپسی کے بعد وہ لکھنؤ میں بھی

مقیم تھے اُسی دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں بحیثیت استاد ان کا تقرر ہو گیا جہاں وہ ریڈر، پروفیسر اور ڈین کے عہدوں پر فائز رہے اور ۱۹۹۴ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مستقل طور پر علی گڑھ ہی میں قیام فرمایا اور اپنے زبان و قلم سے شرعی جہاد کرتے رہے اور مستقل طور پر اسلام اور اس کے عقائد و مسلمات پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے چیرمین اور فیکلٹی آف دینیات کے ڈین کے عہدہ پر آپ فائز رہے اور بڑی خوبصورتی سے اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی میں تن من دھن سے شریک رہے۔ شعبہ کے اساتذہ کے ساتھ کسی بھی عنوان سے آپ تفریق کے قائل نہ تھے بلکہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ سلوک رکھنا آپ کے کردار کا طرہ امتیاز تھا وہ اساتذہ کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی سخت تاکید کرتے تھے اور خود بھی پابندی سے وقت کا لحاظ اور درس و تدریس کے ساتھ منصبی ذمہ داریوں کو ادا کرتے تھے۔

شعبہ میں جب بھی ان کے دور صدارت میں اساتذہ کی تقرری یا پیشماز کی تقرری کا معاملہ سامنے آیا تو وہ اس سلسلہ میں کسی فرد کی سفارش کو قابل قبول نہ سمجھ کر صلاحیت و قابلیت ہی کو معیار قرار دیتے تھے اور اسی کے پیمانے پر انتخاب کرتے تھے اور حقدار ہی کو اس کا

گویا قرآن کریم کا اکتھا سمندر ہو یا علم حدیث کا
ممتزج میدان، علم کلام کی گہرائیاں ہوں یا علم تفسیر کا
ٹھانڈھیں مارتا ہوا قلمزم، علم اصول میں اولۂ اربعہ کے ذریعہ
(بقیہ صفحہ نمبر ۱۶ پر۔۔۔۔۔)

آہ! آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

پروفیسر شاہ محمد وسیم صاحب، علی گڑھ

مولانا کاظم نقوی صاحب مرحوم کے لائق فرزند سید عباس علی نقوی مقیم امریکہ، ملا۔ اس کا ایک ایک لفظ دل کو چھو جانے والا ہے۔ جو قاری کو ان کی شرافت نسبی، انسان دوستی، علمی کدو کاوش اور علم کے بحر بیکراں سے گہر نایاب اخذ کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں اس مضمون میں اس کو شامل کر رہا ہوں، اس لئے کہ اس کا ایک ایک جملہ مولانا کاظم صاحب مرحوم کی علمیت، ان کی گہرائی اور گیرائی، ان کی انکساری اور انسان دوستی کا غماز ہے۔

”گوشِ سماعت کو یقولون مالا تفعلون کا شور تو بہت سنائی دیتا ہے، لیکن فکر و نظر کے آسمان میں ن والقلم وما یسطرون کی کہکشاں کم دکھائی دیتی ہے، زبان و خطابت کی دنیا تو بہت وسیع ہے، لیکن میدانِ قلم کے مجاہد نہایت کمیاب ہیں۔

رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ خاندانِ اجتہاد کے وہ فرد فرید تھے، جنہوں نے اپنے شعور علمی، فکر دینی اور نگاہ حقیقی سے قلم کو مہمیز کیا اور عربی اور فارسی خزانوں کے لعل و جواہر کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ سلمائے اردو کے گلے کا ہار بنا دیا۔“

میں کیا اور میری بساط کیا کہ میں آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ ابن ممتاز العلماء سید ابوالحسن نقوی طاب ثراہ کے بارے میں کچھ لکھوں، لیکن کہا گیا ہے، بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کے بارے میں لکھوں اور ضرور لکھوں۔ حکم سر آنکھوں پر۔ آپ صدر شعبۂ شیعہ دینیات تھے چونکہ میں مولانا سید مجتبیٰ حسن کامونپوری کے دورِ صدارت سے شعبۂ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جڑا ہوا ہوں، اس لئے مولانا سید کاظم نقوی کے صدارت شعبۂ شیعہ دینیات کے دور میں بھی وہاں آتا جاتا رہا۔

مولانا سید کاظم نقوی کے فرزند، بلکہ لائق فرزند سید عباس علی نقوی نے مجھ سے اپنے والد مرحوم پر ایک مضمون لکھنے کو کہا، تو میں نے قلم تو اٹھا لیا مگر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں عالمِ جید، محقق اور نامور مصنف مولانا سید کاظم نقوی اور کہاں یہ ناچیز؟ لیکن تحت الشعور سے آواز آئی کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو لکھنا تو ہے۔ لکھو، ضرور لکھو ہاں علی گڑھ یاد رہے، ضرور لکھو۔

اسی اثناء میں مولانا مرحوم کی مجلسِ چہلم کا رقعہ از طرف ان کے بھتیجے پروفیسر مولانا سید علی محمد نقوی اور

ہوتیں، چائے ملتی اور پھر میں سلام کر کے رخصت ہوتا۔ ان کے ترتیب الفاظ، لکھنوی لہجہ اور زبان اور موثر ترین گویائی کو ذہن میں بسائے اور یہ سوچتے ہوئے کہ آخر کو مولانا ہیں تو ایک فرد خاندان اجتہاد! گفتگو اور صرف الفاظ دونوں اتنے جاذب ”کہ آپ کہیں اور سنا کرے کوئی“ کے مصداق سامع، خیالات و معنی و مطالب میں ڈوب جاتا!

ایک بار جب میں ان کے پاس بیٹھا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپ چپ سے ہیں۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور الماری سے چار کتابوں کے مسودے تخت پر اپنے سامنے بکھیر دیئے اور کہنے لگے کہ ”انہیں کون چھاپے گا؟ کون چھاپے گا؟ میں نے ان کے چہرہ پر نظر کی اور کہا: انشاء اللہ آپ کی یہ سب کتب شائع ہوں گی۔ شاید یہ وہی کتب تھیں، جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ اب ان کے لایق فرزند سید عباس علی نقوی سلمہ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں وہ یکے بعد دیگرے شائع کروادیں اور انہیں ایام عزاء میں امام باڑہ غفران مآب میں برائے ہدیہ رکھوادیں اور جو کچھ حاصل ہو، اسے مولانا کاظم نقوی یادگاری وظائف کے لئے مختص کریں تاکہ کسی ہونہار طالب علم کو فائدہ پہنچے اور مولانا کی یاد بھی لوگوں کے دلوں میں باقی رہے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ اس وظیفہ کو شعبہ دینیات (شیعہ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی

قلیکار، وہ بھی ایسا جو عالم جید ہو، علم کے بحر بیکراں سے گہراں بار ڈھونڈھ لانے میں ماہر ہو اور انہیں صفحہ قرطاس پر اس طرح سے سجائے کہ ہر نگاہ تجسس علم آن ٹھہرے۔ خود اپنی آسودگی کے لئے اور بہار علم و خرد سے یہ کہنے کے لئے کہ لے جاؤ انہیں اور پہنچا دو ان کو ان تک جو سر جھکائے نحو خیال دانشوری و علم و آگہی ہیں۔

شاہراہ علم و آگہی پر گامزن، متلاشی حقایق از دیدگاہ اسلام و ایمان محب محمد و آل محمدؐ، جو صفحہ قرطاس کو خوشبوئے حب و لا سے محمد و آل محمدؐ سے تر کرتا ہے، وہ ہمیشہ یاد کیا جاتا ہے، یہ ہر ذی علم کی ذمہ داری بھی ہے اور فریضہ علم بھی!

مولانا سید کاظم نقوی مرحوم کو ان کی گراں قدر تصنیفات شرح فرائد الاصول، شرح مکاسب، شرح معالم الاصول، شرح نمونہ اور من و اہرمن کی وجہ سے دنیائے علم و آگہی ہمیشہ یاد کرے گی، اور ان کی دیگر تصنیفات کی وجہ سے بھی۔

میں مولانا کاظم نقوی سے ملنے، ان کی خیریت دریافت کرنے اور ان کی علمی گفتگو سے استفادہ کی غرض سے پابندی کے ساتھ ان کے موجودہ مکان پر حاضری دیا کرتا تھا، مکان میں داخل ہوتا تو مولانا مسکرا کر مجھے دیکھتے سلام کا جواب دیتے، خیریت پوچھتے اور پھر ”آپ کہیں اور سنا کرے کوئی“ کے مصداق باتیں

(بقیہ صفحہ نمبر۔۔۔ ۱۳ کا)

استنباط کرنے کا سلیقہ ہو یا علم فقہ میں اس کے اصول و قوانین کے ذریعہ استخراج مسائل کا میدان، علم میزان و منطق میں صحت افکار و نظریات کی جستجو ہو یا علم فلسفہ میں امور عامہ اور الہیات کے مسائل کی توضیح، علم ہیئت میں خطوط و اقطاب و بروج خورشید و قمر کے مباحث ہوں یا علم رمل و عدد کے تحقیقی قوانین۔

تقریباً عقلی اور نقلی دونوں علوم پر قدرت رکھتے تھے اور ہر علم کے حوالہ سے جواہر پارے ان کی سعی و کوشش سے قلم و قرطاس کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ باب شہر علم سے انہیں جو علوم ملے تھے عمر کی آخری سانس تک اس کی نشر و اشاعت میں کوشاں رہے اور زندگی کے آخری لمحات تک اپنے قلم کو گردش دیتے رہے۔

قطعات بیادِ رئیس العلماء

تئویر مہدی نقوی، تئویر سگروری، لکھنؤ

علم و اخلاق کی بوجھار تھے کاظم نقوی
تیرگی میں بھی ضیاء تھے کاظم نقوی
خود تھے خاموش مگر اُن کی کتابیں بولیں
شخص کی شکل میں کردار تھے کاظم نقوی



کیا کروں اُن کے شرف اُن کے مراتب کا بیاں
علم و حکمت سے سرفراز رئیس العلماء
باتیں قرطاس و قلم سے وہ کیا کرتے تھے
خامشی میں تھے اک آواز رئیس العلماء

گڑھ سے وابستہ کر دیا جائے اور اس کی انتخابی کمیٹی میں صدر شعبہ دینیات شیعہ، وائس چانسلر کا نمائندہ نامزد فرد اور تاسیس گزار یا اس کا نمائندہ شامل ہو۔

ایک بات اور وہ یہ ہے کہ مولانا نے ایک بار اثنائے گفتگو مجھ سے فرمایا کہ یونیورسٹی کے قبرستان میں نہ کوئی ماتم ہوتا ہے اور نہ امام حسینؑ اور کربلا والوں کا ذکر، لہذا شہر کی کربلا کے قبرستان میں دفن ہونا بہتر ہے کہ وہاں قرآن خوانی بھی ہوتی ہے اور مجلس و ماتم بھی اور شہر کی تمام انجمنہائے ماتمی اپنے اپنے دستہ کے ساتھ یوم عاشورہ، چہلم اور ۸ ربیع الاول وغیرہ میں سینہ زنی کرتی ہوئی پہنچتی ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ سید عباس علی نقوی سلمہ کو یہ معلوم تھا کہ نہیں مگر ہم سب کے ہر دل عزیز مولانا وہیں پہنچ گئے جہاں جانا چاہتے تھے۔

آخر میں مولانا مرحوم کی مجلس چہلم کے رقعہ سے جس کو مولانا علی محمد صاحب اور ان کے فرزند سید عباس علی نقوی نے تقسیم کیا ہے سے چند فقرے شامل مضمون کر کے بات کو تمام کرتا ہوں: اے محافظ فقہ جعفری، ناشر شرع پیغمبری، خورشید آسمان برتری، عالم علوم حیدری، بے نیاز شکوہ قیصری، سالک مسلک رہبری، نازکش پیام داوری، شانہ کش رموز باقری، کاسہ فکر آذری، حامل صفات قلندری، آئینہ زہد بوذری اور تابش عشق قنبری
رئیس العلماء آیت اللہ سید کاظم نقوی اللہ حافظ۔



رئيس العلماء آية الله سيد كاظم نقوى رحمه الله

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جائسی

پاک صاف اور سادہ، سنجیدہ۔ باعمل، پُر جگر، جہان دیدہ
پتلہ اخلاص کے سراسر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
اک فرشتہ زمیں پہ آیا تھا خاص رشتہ زمیں پہ لایا تھا
عرش والوں کے بس برابر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
صرف چہرہ نہیں کتابی تھا، سر و سینہ کتابخانے تھے
ہاں معارف کے ایک دفتر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
ان کی شروحوں سے علم کے پیاسے استفادہ کریں گے جب بھی سیف
یہ تو کہہ دیں گے مجتہد گر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی



آدمِ خوب و نیک اختر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
چاند سے بھی کہیں منور تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
ہند میں بعد سید العلماء، علم و تقویٰ میں بے نظیر تھے آپ
مالموں کے رئیس و سرور تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
اولیاءِ خدا کی صورت میں ڈھل گئی تھی جناب کی سیرت
بندہ تھے اور بندہ پرور تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
شارحِ مکتبِ رسائل تھے واضحِ مذہبِ مکاسب تھے
علم کا دل، عمل کا پیکر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
تھے علی گڑھ میں گر قیام پذیر کام بھی سب کئے علیٰ والے
عزم و ہمت میں کوہِ پیکر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
اپنی دنیا الگ تھلگ کر کے پڑھنا اور غور کرنا پھر لکھنا
اک عجب طرح کے سکندر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
اہلِ محراب اور منبر کے، تھے، تو اس چاہے، اچھے لگتے تھے
زمینِ محراب، زیبِ منبر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
آلِ غفران مآب ہونے پر طرہ یہ بھائی سید العلماء
مستقل خوبیوں کے محور تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
ہو کے فرزندِ مادرِ گیتی فکر کا آسمان بن کے رہے
علم کے ہاں مگر سمندر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی
خاندانِ اجتہاد سے منسوب اور چلنِ اتحاد سے منسوب
صبر و شکر و عطا کے خوگر تھے آیۃ اللہ کاظم نقوی

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۸ کا۔۔۔۔۔)

یثرب سے چلا ہوا مسافر کہ بلا کی سرزمین پر منزل مقصود
تک پہنچ کر رُکا۔ نوک نیزہ پر سر بلند ہوا اور حسینؑ نے اپنے
سر کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی سر بلند کر کے دم لیا۔ دنیا مٹ
جائے گی۔ مگر حسینؑ کے کارنامے قدرت کی یاد کے ساتھ ہمیشہ
ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

حسینیت زندہ باد

یزیدیت مردہ باد





اصغرا عجاز قاسمی شعبہ دینیات شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آج بھی زندہ ہیں کتابوں میں
گو نہیں اپنے درمیاں کاظم
مسند علم پر تھے اے اصغر
زندگی بھر گھر فشاں کاظم



رمز قدرت کے رازداں کاظم
دین وحدت کے پاسباں کاظم
جس پہ بہتا تھا علم کا دریا
اس زمیں کے تھے آسماں کاظم
جعفری فقہ کے علمبردار
فن میراث کی زباں کاظم
فلسفہ کے رموز سے واقف
علم منطق کے ترجمان کاظم
آشنائے فن کلام و حدیث
علم قرآن کے نکتہ داں کاظم
علم تاریخ کی مکمل شان
اور سیرت کی داستاں کاظم
مقصد علم جفر کا معیار
علم ہیئت کی روح و جاں کاظم
ہند میں جو ہے اجتہاد کی شان
آپ کا ہے وہ آستاں کاظم
قلزم علم و فن میں جو ہے رواں
اُس سفینے کے بادباں کاظم
آج بھی دینیات شیعہ میں
گوشتی ہے تری اذال کاظم

قطعہ تاریخ

مولانا سید محمد رضا ساجد رضوی ساجد زید پوری
وہ غمگسار و عاشق سلطان کربلا
کرتا ہوا وہ ماتم سرور چلا گیا
نشر علوم حق میں بسر کر گیا حیات
دنیا سے علم و فضل کا پیکر چلا گیا
ماتم کناں ہے مسند تعلیم و تربیت
تعلیم کا بنا کے مقدر چلا گیا
کس جا پہ جائیں غوطہ زن علم و معرفت
وہ علم و معرفت کا سمندر چلا گیا
ساجد صدایہ دے گئی تاریخ انتقال
کاظم، بہشت آل پیمبر چلا گیا



اسلام کی ضرورت

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

ہے، علم اور سائنس کے موجودہ روشن زمانے میں اسلام کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہر شے کی ایک معین عمر ہوتی ہے۔ اسلام اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے۔ حیات انسانی کی تعمیر میں جتنا حصہ لینا تھا لے چکا اب اسلام کی جگہ علم نے لے لی ہے۔ اس کا دائرہ ہدایت مذہب سے وسیع تر ہے۔

درحقیقت یہ آوازیں انہی لوگوں کے دہن سے نکلتی ہیں جو اسلام کے بنیادی مقاصد سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں انہوں نے اسلامی مٹح نظر کا دائرہ بہت تنگ اور مختصر فرض کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اسلام کو ان مفروضہ مقاصد میں جس حد تک کامیابی ہو سکتی تھی وہ ہو چکی۔ اب مزید توقع فضول ہے۔ اسلام بت پرستی کا سد باب کر کے انسان کے سر کو خدائے یکتا کی بارگاہ میں جھکانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس کے آنے سے پہلے عرب متفرق، باہم دست و گریباں قبائل میں منقسم تھے اسلام نے الفت و برابری کے جذبات پیدا کر کے انہیں ایک قوم کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شراب نوشی، قمار بازی، جنگ جوئی اور دختر کشی

اہل مغرب کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کا انسان مذہب سے بے نیاز ہے۔ وہ دن بیت گئے جب وہ دین کا محتاج تھا۔ انہوں نے حیات انسانی کے سلسلہ وار تین دور قرار دیئے ہیں دور جہالت و خرافات، دور مذہب و دیانت، دور علم و معرفت، مغرب مذہب دشمنی کی اس راہ پر اپنی طبعی رفتار سے نہیں گیا ہے اس کا باعث وہ عظیم کشمکش ہے جو علم اور کلیسا کے درمیان یورپ میں کبھی ہو چکی ہے اس تصادم نے انہیں ایک ہمہ گیر غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ان کو اہل کلیسا کی تنگ نظری نے سرے سے مذہب کے نام سے بیزار بنا دیا۔ وہ سمجھے کہ دین انحطاط و پس ماندگی مراجعت و قدامت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ یہ سیل اہل مغرب کی اکثریت کو اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ سارے ماحول پر تمام و کمال مادیت کا رنگ چڑھ گیا۔

مذہب دشمنی کی اس وبا کا دائرہ کشادہ سے کشادہ تر ہوتا گیا رفتہ رفتہ مسلمان بھی کہنے لگے کہ ترقی اور کامیابی کا خواب بلا مذہب سے جدا ہوئے شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مغرب کی طرح دین کو پس پشت ڈال کر آگے بڑھنا چاہئے۔ اسلام ایک کہنہ اور فرسودہ مذہب

عام مشغلہ تھا اسلام نے عربوں کو ان عادتوں سے روکا کہیں کامیابی ہوئی اور کہیں نہیں ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی تحریک اپنے نقطہ انتہا تک پہنچ چکی ہے اس کے مختتم نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں ضرورت ہے کہ اب ہم اپنے موجودہ مسائل زندگی کے حل کرنے میں تازہ علمی اصول اور مبادی کو راہنما قرار دیں۔

اسلام کا بنیادی مطمح نظر

آج کل کا ذہنی بہاؤ اس سمت میں ہے، یہ خیالات صاف بتلا رہے ہیں کہ دنیا ابھی اسلام کے بنیادی مطمح نظر سے ناواقف ہے آئیے ہم اور آپ مل کر روح اسلامی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نام ہے ہر اس اقتدار ارضی سے آزادی کا جو انسان کو راہ خیر میں ترقی سے روکے، اسلام نام ہے ان بوالہوس انسان نما شیطانوں کے شکنجہ اقتدار سے آزادی کا جو افراد انسانی کو ڈرا دھمکا کر اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں، وہ کہ جن کے شاہانہ احکام حق اور انصاف سے پوری ٹکڑ لیتے ہیں، وہ کہ جو انسانوں کی عزت نفس، خودداری، آزادی فکر اور جان و مال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اسلام ان باطل طاقتوں کے مقابل ذہن انسانی میں خدائے مالک الملک کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو اس کی شخصیت کا شناسا بناتا ہے۔ کھلی لفظوں میں اس کا اعلان ہے کہ انسان پر خدا کے علاوہ کسی کو حکومت کا

حق نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اسلام لا الہ الا اللہ کے ذریعہ فقط چوب و سنگ کے بنے ہوئے بتوں کی معبودیت کا انکار کرتا ہے۔۔۔ نہیں اسے اللہ کے سوا کسی طاقت کے سامنے انسان کا جھکنا پسند نہیں ہے۔ اسلام خدا کی بارگاہ میں بھی سر جھکانے کی دعوت نہ دیتا اگر یہ انسان کی شرافت نفس کا ذاتی تقاضا نہ ہوتا۔

آج جب کہ مسلمان کو اپنے دام بندگی میں اسیر کرنے کے لئے ہر طرف سے ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔ آج جب کہ سارے مسلمان ملک بیرونی طاقتوں کے رحم و کرم پر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

آج جب کہ مسلمانوں کی ذاتی دولت ڈھوڑھو کر اغیار اپنے گھروں کو بھر رہے ہیں۔ آج جب کہ سرمایہ دار مزدوروں کا خون چوس کر اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔

آج جب کہ سامراج کی جڑیں اکثر مسلمان ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں کیا اسلام کے اس اعلان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ہر اقتدار ارضی سے آزاد ہے؟ یہی وقت ہے کہ ہم وحدت اسلامیہ کے جھنڈے کے سایہ میں خارجی طاقتوں کی کثافت سے اپنی زمین کو پاک کر دیں۔ ان کے خبیث اور مخوس پنجہ اقتدار سے اپنی جان و مال، عزت و آبرو، عقیدہ اور فکر کو چھڑالیں۔ یقیناً اس اقدام سے صرف مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ یہ سارے عالم کے واسطے امن و سلامتی کا

پیغام ہوگا۔

اس وقت تمام دنیا دو بڑے ایک دوسرے کے مخالف طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری۔ یہ دونوں تقریباً برابر کی قوتیں ہیں جو ہمیشہ باہم دست و گریباں ہیں۔ ان دونوں کے درمیان رقابت اس کمزور طبقہ کی بدولت ہے جس پر ہر ایک اپنا اثر قائم کرنا چاہتا ہے اگر عالم اسلام اپنا کھویا ہوا حقیقی استقلال واپس لے لے تو اس سے یہ عظیم الشان فائدہ ہوگا کہ ان دونوں مخالف عنصروں کے لئے وجد رقابت باقی نہیں رہے گی۔ اسلام وہ حریت پسند مذہب ہے جو کسی بیرونی طاقت کا کیا ذکر انسان کو خود اس کی نفسانی خواہشوں کی غلامی میں بھی نہیں دینا چاہتا۔ اس کی سچی تمنا ہے کہ انسان جذبات ہو اور ہوس کے ساتھ خواہش زیست تک کی قید و بند سے آزاد ہو جائے۔ اس کی نظر میں اس زندگانی دنیا کی کوئی قدر و قیمت حریت ضمیر کے مقابلہ میں نہیں ہے۔

باطل قوتیں انسان کا سراپے سامنے جھکانے کے لئے اس کے نفسانی خواہشات کو بھی آلہ کار بناتی ہیں۔ زر، زن، زمین کی لالچ دلا کر بھی ضمیر کی خریداری ہوتی ہے۔ حق سے منحرف کرنے میں جب تمام ذرائع ناکارہ ثابت ہو جاتے ہیں تو آخر میں قتل کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اسلام انسان کو ہمت دلاتا، وہ کہتا ہے کہ اس تہدید کے

مقابلہ سپر انداختہ نہ ہونا چاہئے۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
وَأَخَوَانُكُمْ وَآزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ بَاقَتْكُمْ مَوَاطِنُهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ
مِّنْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا
حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفَاسِقِينَ۔

”اے رسول مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمہیں اپنے آباؤ اجداد اپنے بچے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے اعزاء، اپنی کمائی ہوئی دولتیں، اپنی تجارتیں جن کے ناکام ہونے سے تم ڈرتے ہو، اپنے پسندیدہ مکانات خدا، اس کے رسول، راہ الہی میں جہاد سے زیادہ چہیتے ہیں تو امر الہی موت کا انتظار کرو۔ خدا فاسقوں کو منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچائے گا۔“ (سورہ توبہ آیت ۲۴)

بے شک نفس انسانی نگاہ خالق میں چونکہ اپنی جگہ قیمتی ہے لہذا اسے ضائع نہ ہونا چاہئے۔ اپنے نفس اور اس مقصد کے درمیان توازن کی ضرورت ہے جو قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے موازنہ کے بعد اگر پہلے مقصد گراں بار نکلے

تو انسان کا جان دے دینا حیات جاوداں کا ضامن ہے۔

نفسانی خواہشوں سے آزادی کی حمایت کرنے میں اسلام کے پیش نظر دو فائدے ہیں۔ ایک وہی کہ انسان طاغوتی اور جبروتی طاقتوں کا آلہ کار نہیں بنے گا بلکہ وقت آنے پر ان کا پُرتبات مقابلہ کر سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اسے نفس کی تابعداری سے چھٹکارا پا کر اپنی ذات اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جذبات کے دریا میں غرقاب انسان کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ نسبتاً لذات دنیا سے زیادہ لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن اسے نہیں معلوم کہ یہی موسرائی عنقریب بدبختی اور محتاجی کا ایک ایسا طوق اس کو پہنا دے گی جس سے گلو خلاصی ممکن نہ ہوگی۔ خواہش اور ہوس کی پیاس کبھی بجھتی نہیں ہے اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آجاتا ہے کہ انسان کے فکر و عمل کی ساری توانائیاں انہی خواہشوں کی شکم پری میں صرف ہوتی ہیں وہ ایک بہیمانہ زندگی گزارتا ہے۔ اسے سماجی مسائل سے نہ کوئی دلچسپی رہ جاتی ہے اور نہ وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ عیش و عشرت کی دلدادہ قومیں انسانیت کی کبھی کوئی خدمت نہیں کر سکیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ترقی کے بجائے آخر میں انہیں اپنی آزادی تک

سے دستبردار ہونا پڑا۔ روم، یونان، اور فارس کے اقبال و چشم کو کس نے لوٹا؟ گزشتہ جنگ عظیم میں بلند و بالا دعوے کرنے کے بعد فرانس کا کیا حشر ہوا؟ تاریخ دول و اقوام میں ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں ملیں گی کہ ہوا و ہوس کی بندگی کے بعد کوئی قوم پنب نہیں سکی۔

یہی راز تھا کہ اسلام نے نفسانی خواہشوں سے آزادی دلانے میں پوری کوشش کی۔ اس کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ زندگی کی تمام لذتوں پر قدغن کر کے انسان کو ان سے محروم کر دیتا۔ اسلام نے اس راہ کو اختیار نہیں کیا۔ اس نے ہر شخص کو لذات حیات کی ایک معقول مقدار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی۔

”كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا“ (سورہ اعراف آیت ۳۱)
 ”کھاؤ پیو مگر حد سے آگے نہ بڑھو“ اس کے ساتھ اسلام نے ہدایت کردی کہ تمہاری ذہنی اور عملی ساری توانائیوں کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود اور اعلاء کلمہ حق میں صرف ہونا چاہئے۔ فرد و جماعت کے حقوق کے توازن کا یہ وہ بلند نظریہ ہے جس کا تن تنہا مالک بس اسلام ہے۔ کیا انسان نفسانی خواہشوں کے شکنجہ سے اب نکل آیا ہے کیا اس کی صلاحیت اور طاقت کا بیشتر حصہ جامعہ بشریت کے سود و بہبود میں صرف ہونے لگا ہے؟ یقیناً ان سوالوں کا جواب نفی میں ملے گا۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اسلام چودہ سو برس پہلے کے انسان کا

دستور زندگی ہے۔ موجودہ مشکلات حیات کے حل کرنے میں اس کی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہے؟

اسلام ترقی پسند مذہب ہے

اسلام کے غیر ضروری ہونے کا نعرہ بلند کرنے والوں نے یہ مانا ہے کہ وہ دور جہالت و وحشت کی پیداوار نہیں ہے۔ اس نے نوع انسانی کو جہالتوں اور خرافاتوں سے نجات دی ہے ان کی نوعیت مختلف تھی۔ بعض عوام کی تراشی ہوئی تھیں اور بعض عیسائیوں اور یہودی علماء کے دماغوں کی ایجاد تھیں۔ انسانیت کا سراپے ہاتھوں کے بنائے ہوئے چوب و سنگ کے بے شعور بتوں کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اسلام نے بشریت کا سر بلند کر دیا۔ اس نے حقائق کائنات میں غور و خوض کرنے کی دعوت دی۔ وہ منفرد دعوت جس میں عقل و مذہب اور علم و دین کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہوتا اب نہ ایمان باللہ کے معنی خرافات اور جہالت کے ہیں اور نہ حقائق علم کا ماننا کفر باللہ کے مترادف ہے۔ اسلام نے پہلی مرتبہ یہ ذہن انسانی میں راسخ کیا کہ ہر وہ حقیقت جس کا انسان انکشاف کرے، اللہ کی توفیق اور امداد کا نتیجہ ہے۔ اس لئے وہ شکرگزاری اور عبادت کا مستحق ہے۔ یہ سارا عالم اور اس کے پوشیدہ فوائد انسان کی خاطر خلق ہوئے ہیں۔

جہالت اور خرافات غیر معقولیت اور نامنطقیت کو کہتے ہیں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے جس سے انسان اس

وقت باہر نہیں نکل سکا۔ تقریباً آدھی دنیا آج بھی بت پرستی کا شکار ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کا دوسرا نصف حصہ ایک دوسری خرافات میں مبتلا ہے..... اس کا نام سائنس ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ علم سائنس علم و معرفت کا زبردست ذریعہ ہے۔ اس نے انسان کو ترقی اور تمدن کی راہ میں بہت آگے بڑھایا ہے۔ ہم سائنس کے مخالف نہیں ہیں لیکن وسائل معرفت اسی میں محدود نہیں سمجھتے۔ ہم اس خدا کو خدائے وحدہ لا شریک کا درجہ نہیں دے سکتے۔ اہل مغرب نے بشریت کی فکری جولانیوں کو حواس اور تجربے کی چار دیواری میں محدود بنا دیا ہے۔ یہ چار دیواری اپنی جگہ بہت کشادہ صحیح لیکن انسان کی نظری اور ذہنی صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے کے لئے ناکافی ہے۔ جب کہ انسان کی علمی توانائی تجربے اور حواس کے میدان میں محدود نہیں ہے تو دنیا کو کیوں اصرار ہے کہ ہر چیز کو ہم علم تجربی کے ذریعے مانیں گے؟ یہی اصرار نامعقولیت ہے جس کا دوسرا نام جہالت ہے، دنیا کو ان جہالتوں سے نجات کے لئے اسلام کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح عبودیت اصنام سے چھٹکارے کے واسطے تیرہ سو برس پہلے احتجاج تھی۔

اسلام کی افادیت اور ہمہ گیری

حالیہ مسائل کا کون سا شعبہ ہے جس کے لئے دین اسلام میں ہدایات نہ موجود ہوں؟ اسلام محض عقیدہ

روحی، تہذیب اخلاقی اور دعوت فکری کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل، قابل عمل دستور زندگی ہے، اس نے سیاسی، اقتصادی، معاشی، سماجی ہر میدان میں نوع انسانی کی تشفی بخش راہنمائی کی ہے، وہ منفرد راہنمائی جس میں فرد و جماعت، علم و شریعت، عمل و عبادت، دنیا و آخرت باہم وابستہ اور مرتبط ہیں۔ یہاں موقع نہیں ہے کہ ہم نظام اسلامی کے متعلق مفصل بحث کر سکیں۔ صرف چند بنیادی حقائق و نکات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ اسلام محض فکری اور نظری مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک عملی نظام ہے جو انسانی ضروریات اور نفسیات کا جائزہ لے کر مرتب کیا گیا ہے۔

۲۔ اسلام نے اس نظام زندگی کی تشکیل میں ہر نقطے پر اعتدال انصاف اور توازن کا لحاظ کیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے جسم و روح کے تقاضوں میں توازن قائم کیا۔ دونوں کے واسطے حدود معین کر دیئے۔ ان حدود میں ایک کو دوسرے کی مزاحمت کا حق نہیں ہے۔ اسلام انسان کو نہ حیوان کی طرح مادی اور مطلق العنان بنانا چاہتا ہے اور نہ فرشتوں کی طرح خالص روحانی، مادیت سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے قدم ایسے وسطی نقطے پر ہوں کہ جسم و روح کے درمیان کوئی کشمکش نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد اسلام نے فرد جماعت کے مطالبات

میں باہم توازن قائم کیا۔ ہر ایک کے حقوق مقرر کر دیئے نہ ایک فرد دوسری فرد کے ساتھ زیادتی کر سکتی ہے۔ نہ جماعت کو فرد کی حق تلفی کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ نہ فرد جماعت اور اس کے مفاد پر مسلط ہو سکتی ہے نہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے حقوق غصب کر سکتا ہے، نہ ایک قوم دوسری قوم پر ظلم و تعدی کی مجاز ہے۔ مذہب کا دستور اور اس کے تعزیرات ان سب کے درمیان تصادم سے مانع ہیں۔

انسان مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ وہ مادی اور اقتصادی ضروریات کے ساتھ خالق روحانی اور انسانی تقاضے بھی رکھتا ہے۔ اس کے لئے مفید ترین نظام حیات وہ ہوگا جو اس کی زندگی کے ہر پہلو کی ہمہ گیر اور جامع نگرانی کر سکے۔

نظام اشتراکی انسان کے صرف اقتصادی اور معاشی مشکلات کا حل پیش کرنے کا دعوے دار ہے۔ اس کے پاس روحانی اور انسانی پیاس بجھانے کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یونہی اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب انسان کی روحانی خواہشوں کی سیرابی کا اپنے ساتھ سامان رکھتے ہیں مگر وہ ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا مکمل دستور نہیں دیتے جس کو ہم اپنے اقتصادی اجتماعی اور سیاسی مسائل میں رہنما بنا سکیں۔

۳۔ اسلام کے سماجی اور معاشی نظام کو انفرادی

واستقلالی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے موجودہ نظاموں میں سے کوئی تمام وکمال اس کے مطابق نہیں ہے۔ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مغایر تیسرا نظام ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کچھ اچھائیاں رکھتا ہے اور کچھ برائیاں۔ اسلام ان دونوں کے محاسن کا جامع ہے۔ اسلام میں فرد کو اساسی حیثیت نہیں دی گئی ہے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ فرد کے اوپر جماعت کے حقوق کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ یونہی وہ مشرقی یورپ کی طرح جماعت کے مفاد پر فرد کو بھی نہیں قربان کر سکتا۔ وہاں فرد ہوا میں منتشر ایک حقیر ذرہ ہے۔ وہ جماعت سے اپنے حقوق کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ یقیناً حریت فرد کی یہ حد بندی اس کی آزادی کو بحال رکھنے کی غرض سے کی گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زر، زن، زمین اکثر و بیشتر مفسد کی اصل اسیل ہے۔ افراد انسانی کو ان خرابیوں سے بچانا ضروری ہے۔ اس کے لئے اس کے جنبہ انسانیت کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی تدبیر نکالنا چاہیے۔ انسان کا جو ہر امتیازی ہے اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ برائیوں سے بچنا، بلاشبہ اشتراکیت اس کو سرمایہ داری کے مفسد سے بچاتی ہے لیکن انسان کی قوت اختیار کو چھین کر بھلا دیتا ہے اس میں انسان کی خصوصیت کیا ہے۔ اس طرح تو جانور کو بھی برائی سے روکا جاسکتا ہے؟!!

اس کے مقابلہ میں اسلام ایک فطری، معتدل اور متوازن نظام ہے۔ اس کو فرد اور جماعت دونوں کے حقوق کا لحاظ ہے۔ وہ فرد کی محدود آزادی کا قائل ہے۔ وہ اس کی قوت اختیار کو سلب نہیں کرتا ہے۔ بے شک اس نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے نمائندے کو نگرہاں بنا دیا ہے کہ وہ اجتماعی انصاف کے قانون کا نفاذ کرتے ہوئے فرد کو جماعت پر مسلط نہ ہونے دے۔ اس کے نزدیک ہر شخص وہاں تک آزاد ہے کہ اس کی شخصی آزادی دوسروں کے حقوق میں خلل انداز نہ ہو۔ اس کی بابت تاریخ اسلام میں پیغمبر اسلام کے ارشادات اور فیصلے محفوظ ہیں۔

سمرہ ابن جندب کا مملوک درخت ایک مرد انصاری کے گھر میں تھا۔ سمرہ بلا اجازت حاصل کئے اپنے درخت کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ انصاری نے سمرہ سے کہا کہ آواز دے کر گھر میں داخل ہوا کرو۔ انھوں نے انکار کیا۔ بات جناب رسالت تک پہنچی آپ نے سمرہ سے فرمایا کہ اجازت لے لیا کرو۔ انھوں نے قبول نہ کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تم اس درخت کو فروخت کر ڈالو۔ سمرہ راضی نہ ہوئے رسولؐ نے یہ دیکھ کر سمرہ سے فرمایا ”ما ارأىک یا سمرۃ الا مضار“ ”سمرہ تم دوسرے کو ضرر پہنچا رہے ہو“ پھر آپ نے اس مرد انصاری کی طرف رخ کر کے حکم دیا: اذهب فاقلعها وارم بها وجهه فانما لا ضرر ولا ضرار فی

الاسلام۔ ”جاؤ اس درخت کو اکھاڑ کر اس کے منہ پر پھینک دو کیونکہ اسلام کسی ضرر رسانی کو برداشت نہیں کر سکتا۔“

ایک دو نہیں نظام اسلامی میں بکثرت موارد ملتے ہیں جہاں اس نے اجتماعی مفاد کو شخصی منفعت پر مقدم کیا ہے۔ اس نے ظلم کی اعانت کو مطلقاً حرام قرار دے دیا خواہ انسان کو اس سے کیسا ہی عظیم شخصی فائدہ ہو رہا ہو۔ اموات کا غسل دینا، کفن پہنانا، دفن کرنا واجب ہے۔ اس پر اجرت لینے کی ممانعت کر دی۔ نماز میں اذان اطلاع عام کے لئے کہی جاتی ہے۔ شریعت نے اس کی مزدوری لینے کو ناجائز کر دیا۔ قاضی دوسروں کے قضایا کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے لئے اس سلسلے میں رشوت کا کیا ذکر اجرت تک لینا جائز نہیں ہے۔ صاحبان اقتدار کے واسطے کمزور عوام کے اموال پر قبضہ کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسلام ان کے دیئے ہوئے تحفہ، عطیہ انعام کا لینا حرام سمجھتا ہے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی چیز بازار میں نایاب ہونے لگتی ہے تو سوداگر اس کو ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ وہ انتظار کرتے ہیں کہ جب یہ بازار سے بالکل مفقود ہو جائے تو قیمت بڑھا کر اسے فروخت کریں۔ اصطلاحاً اس عمل کو ”اختکار“ کہتے ہیں۔ اسلام کو یہ بے جانفع اندوزی پسند نہیں ہے۔ وہ ان تاجروں کو نیچے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ ناقابل تحمل ہے کہ

چند آدمیوں کے فائدے کی خاطر پوری جماعت کو پریشانی میں دیکھے۔ نوع انسانی کو اسلام نے یہ ہدایات اس وقت کئے جب عدل اجتماعی کا کوئی مفہوم اس کے ذہن میں نہ تھا۔ اس نے اس نظام اقتصادی کی تشکیل اور تدوین اس وقت کی جب لوگوں کے دماغ اس کے تصور سے بالکل سادہ تھے۔

انسان اپنے تمام علم و معرفت کے بعد دنیاۓ اقتصاد و اجتماع میں دو نظام پیش کر سکا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت، اسلام اپنی جامعیت کی بدولت ان دونوں سے برتر ہے۔

کارل مارکس نے انسان کی بنیادی ضرورتوں کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا ہے۔ غذا، جائے سکونت اور جنسی سیرابی کا انتظام اس کی طرف سے ہونا چاہئے۔ یہ اسلام کے چودہ سو برس پہلے کے منشور عام کا ایک جز ہے۔ رسول اسلام کا اعلان ہے ”من کان لنا عاملاً ولم تکن له زوجة فلیتخذ زوجة ولیس له مسکن فلیتخذ له مسکناً ولیس له خادم فلیتخذ له خادماً ولیس له دابة فلیتخذ له دابة“ ”جو شخص ہمارا کام کرے اور ناکتھا ہو اس کی شادی ہونا چاہئے۔ رہنے کے واسطے گھر نہ ہو تو اس کا انتظام ہونا چاہئے۔ خادم اور سواری کی ضرورت ہو تو وہ مہیا کرنا چاہئے۔“

یہ آنحضرتؐ کا عام ارشاد ہے۔ اس میں حکومت کے وہ تمام ملازمین داخل ہیں جو مختلف شعبوں میں خدمات پر مامور ہوں۔ یہ ان مزدوروں کو بھی شامل ہے جو حکومت اسلامی کی طرف سے قائم کردہ کارخانوں میں کام کریں یہ اشتراکیت کا وہ رخ ہے جو اسلامی نظام کے موافق ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی باتوں میں دونوں کے درمیان شدید تصادم بھی ہے۔ اسلامی نظام کے یہ چند پہلو تھے جن کی بابت اجمالاً کچھ عرض کیا گیا۔ انصاف کیجئے کہ وہ مذہب جو حیات بشری کے اس لمبے چوڑے میدان کا مکمل احاطہ کئے ہو۔ وہ مذہب جو نوع انسانی کے افکار و خیالات، اعمال و عبادات، اقتصادیات و اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات کا جامع دستور العمل ہو کیا دنیا اس سے کبھی بے نیاز ہو سکتی ہے؟

آج جب کہ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں قومی
عصبیت نے وحشیانہ شکل اختیار کر لی ہے اسلام کی شدید
ضرورت ہے، وہ اسلام جس نے سیکڑوں برس پہلے کالے
اور گورے، غلام اور مالک کے درمیان عملاً مساوات قائم
کر دی۔ مساوات کا کیا ذکر اس نے زید ابن حارثہ اور
ان کے بیٹے اسامہ کو مہاجرین اور انصار کی فوج کا سالار
بنادیا۔ رسولؐ نے فرمایا: اسمعوا واطیعوا ولو
استعمل علیکم عبد حبشی کان راسه

زبينة ما اقام فيكم كتاب الله تبارك
وتعالى.

آج جب کہ ہر طاقتور سلطنت کا مطمح نظر ملک گیری بنا ہوا ہے کمزور انسانیت کی نگاہیں اسلام کے چہرے پر ہیں، وہ اسلام جس نے نفع اندوزی کی خاطر ملک گیری کو ناجائز قرار دیا ہے، وہ دیکھیے رسول اسلامؐ مکہ معظمہ میں عظیم فوج کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، اہل مکہ کو اپنی سلطنت منوانے کے لئے نہیں بلکہ ان کے درمیان اسلام کا پیغام پھیلانے کی غرض سے دنیا کی حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب رسولؐ اپنے خون کے پیاسوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: اذهبوا انتم الطلقاء۔

آج جب کہ دنیا کی اکثریت سرمایہ داری کے مہلک مفاسد میں مبتلا ہے کیا اس نظام اسلامی کی ضرورت نہیں ہے جس نے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کو حرام کر دیا ہے؟ ان دونوں پر اس وقت سرمایہ داری کا دار و مدار تھا۔

آج جب کہ اشتراکیت کی وجہ سے مادیت والحاد نے سارے عالم میں اپنا اثر قائم کر لیا ہے روحانیت اسلام کا پیغام سننے کے لئے گوش برآواز ہے جو روحانیت کے چشموں کو خشک کئے بغیر جماعت کے ان تمام اقتصادی ضروریات کی کفالت کر لیتا ہے جن کے لئے نظام اشتراکیت کو اختراع کیا گیا ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۳ پر۔۔۔۔۔)

اسلام کیا چاہتا ہے؟

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

کوئی دوسرا دشمن نہیں ہے۔ یہ چیزیں انسان کے سکون کو اس سے چھین لیتی ہیں۔ اُسے چاہئے کہ اپنی تمام طاقتوں کو سمیٹ کر نہایت سچائی، باہمی خلوص، مضبوط ارادے، مکمل احتیاط، آپس کے تعاون اور مشورے کے ساتھ ان تینوں دشمنوں کا مقابلہ کرے۔

اسلام نے ان کی مکمل بیخ کنی کے لئے انتہائی مؤثر اور طاقتور ذرائع اختیار کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اگر انسان اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا تو بہت جلد معمولی سی کوشش کر کے، چھوٹا سا راستہ طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ جاتا، وہ نہ جاہل رہتا، نہ بیماری اس کے پاس پھٹکتی اور نہ غربی و تنگ دستی۔

دنیا کی حکومتوں کے بڑے بڑے سربراہ اپنی دھواں دھار تقریروں میں جہالت، بیماری اور تنگدستی کے متعلق باتیں تو برابر کرتے ہیں لیکن کسی طرح انسانیت کو ان تینوں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔

۱۔ علم ہی علم

اسلام جہالت اور نادانی کا جانی دشمن ہے۔ وہ جہاں بھی ہو، جس شکل و صورت میں بھی ہو، اسلام نے اس کے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شرک کی

انسان کا فریضہ ہے کہ رُوئے زمین پر رہ کر کام کرے، کوشش کرے، محنت و مشقت سے جان نہ چُرائے، زمین کو آباد کرے، خدائی اسرار و رموز کے چہرے سے جہالت کی نقاب ہٹائے، اس کی ہمہ گیر اصلاح کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔

لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس اہم فریضہ کو پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ علم کے بغیر انسان اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اچھا کیا اور برا کیا ہے؟ مفید کیا اور نقصان رساں کیا ہے؟ یونہی تندرستی کے بغیر اس کا دماغ صحیح کام نہیں کر سکتا، وہ مسائل کو ٹھیک طرح سلجھا نہیں سکتا، وہ کوئی بھاری کام کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب تک انسان کے ہاتھ میں پیسہ نہ ہو، اس کی زندگی کے باعزت طریقہ پر بسر ہونے کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی، ترقی اور اصلاح کا کوئی منصوبہ عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم، دولت اور تندرستی تین ایسے اہم عناصر ہیں جن پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ ان کے بغیر انسانی زندگی کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بظاہر جہالت، بیماری اور تنگدستی سے زیادہ خطرناک انسانیت کا

جہالت کا مقابلہ توحید کے ذریعہ، اندھی تقلید کا مقابلہ دلیل و برہان کے ذریعہ، یہودہ عادتوں اور موہومہ خرافات کا مقابلہ صحیح اور عاقلانہ آداب و روایات کے ذریعہ کرتا ہے۔ یقیناً سب سے پہلے اسلام نے جہالت سے زبردست جنگ شروع کی۔ اس نے لکھنے پڑھنے کی تعلیم کو اہم قرار دیا، قلم کے مرتبے کو بلند کیا۔ سب سے پہلی آسانی آواز جو وحی اول کی صورت میں پیغمبر اسلام کے گوش زد ہوئی، وہ یہ ہے:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(سورہ علق آیت ۵-۱)

”پڑھو اپنے پالنے والے کے نام کے سہارے جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو پیدا کیا خون سے، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کرم فرما ہے جس نے قلم کے ذریعہ پڑھایا۔ اس نے انسان کو وہ سب کچھ پڑھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

خداوند عالم نے ان الفاظ کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ پڑھنا علم کی سیرھی ہے۔ اس کے بعد ہدایت کی جاتی ہے کہ خدا کے نام کا سہارا لیں۔ اس طرح قرآن مجید نے پڑھنے کی قدر و منزلت کو نمایاں کیا ہے، پھر اس نے پہلے عمومی خلقت اور اس کے بعد انسان کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اسی کے پیچھے پیچھے قلم

کے ذریعہ لکھنا سکھانے کا تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی درحقیقت انسان کا وجود اور علم و قلم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ اس سے شاید اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور خدا کی نظر میں جاہل شخص کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسلام جس طرح بغیر کسی قید کے پڑھنے کا حکم دیتا ہے، اسی طرح بغیر کسی قید کے وہ علم کا بھی طالب ہے۔ وہ اس سلسلے میں کسی محدودیت کا قائل نہیں ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے:

”هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“ (سورہ زمر: ۹)

”آیا جاننے والے اور نہ جاننے والے ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں۔“

”يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ“ (سورہ مجادلہ: ۱۱)

”خدا تم لوگوں میں سے ان اشخاص کے مرتبہ کو بلند کرتا ہے جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا۔“

قرآن مجید کے نقطہ نظر سے اس آیہ مبارکہ کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے علم سے مراد ہر ایسی چیز کا جاننا ہے جو ان فرائض کے انجام دینے میں انسان کی مدد کرے جو اس کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں۔ یہ فرائض دنیا سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں اور آخرت سے بھی۔ اس اعتبار سے اسلام ہر اس علم کا طالب ہے جو انسان کو فائدہ پہنچائے، انسانیت کے آگے بڑھانے کا موجب ہو اور اس کو خوش

حال بنائے، اس کی حقیقی مصلحتوں کے مطابق ہو، جن کا یقین بس اسی ذات کی طرف سے ہو سکتا ہے جو انسانیت کے واقعی، فطری تقاضوں سے مکمل طور پر واقف ہو۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے تمام انبیاء و مرسلینؑ کے بھیجے جانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ لوگ علوم طبیعیہ (Natural Sciences) اور خالص مادی فنون کو حاصل کریں، کیونکہ خود انسان کی فطرت میں جستجو اور کھوج کرنے کا جذبہ رچا بسا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنی زندگی میں طرح طرح کی چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ضرورتوں کا یہ احساس اور تحقیق کرنے کا فطری جذبہ بہت بڑا محرک ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کو حاصل کرے۔ بنیادی طور پر قرآن کریم، پیغمبر اسلامؐ بلکہ تمام انبیاء و مرسلینؑ کا مرکز توجہ بس دو چیزیں تھیں ایک اُن کے عقائد و افکار، دوسرے ان کی سماجی زندگی کے لئے صحیح ترین اصول و قوانین۔ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کی گھٹیا ذہن انسانی نہیں سلجھا سکتا، کیونکہ اس کا دائرہ عمل محدود ہے، خود انسانی وجود اس کے لئے ایک معمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انبیاء و مرسلینؑ کی تمام کاوشوں کا اصلی اور ابتدائی مرکز لوگوں کے عقائد کا سدھارنا اور انھیں صحیح انسانی زندگی کا راستہ دکھانا ہے۔

”الرَّ - كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔“ (سورہ ابراہیم: ۱)

”اے میرے نبی! یہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہارے اوپر اس لئے نازل کیا ہے کہ تم تمام لوگوں کو ان کے پالنے والے کی اجازت سے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، اس خدا کے راستہ پر انھیں چلاؤ جو ہر چیز پر تسلط رکھنے والا اور قابلِ تعریف و ستائش ہے۔“

لیکن یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ افراد انسانی اپنی زندگی کے اعتقادی، قانونی اور اخلاقی شعبوں میں انبیاء و مرسلینؑ کے ہدایات سے بھرپور فائدہ اسی صورت میں حاصل کر سکتے تھے، جب کہ اُن کے دماغوں کو ان اسرار و رموز کی طرف متوجہ کیا جائے جو موجوداتِ عالم کے دلوں کی گہرائی میں چھپے ہوئے ہیں، وہ ان اصول و قوانین کو جاننے کی کوشش کریں جو اس پوری کائنات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں، وہ ان اثرات اور خاصیتوں کا پتہ چلائیں جو ان موجودات کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں۔ اس طرح قرآن مجید، پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے پیغمبروں نے بواسطہ ذہن انسانی کی زمین کو نیچرل سائنس اور دیگر مادی علوم و فنون کی پیش رفت کے لئے ہموار کیا ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں یہ قرآن کریم ہے جسے ہم مسلمان آسمانی کتاب سمجھتے ہیں، وہ ایک طرف اپنا منصفی فریضہ یہ قرار دیتا ہے کہ لوگوں کے عقائد و افکار کی اصلاح کرے، انہیں یہ بتائے کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح مطابق فطرت طریقہ کیا ہے، دوسری

کے عجیب و غریب نظم و ضبط کے عمق تک پہنچنے کی کوشش کرے جس کا دوسرا اصطلاحی نام نیچرل سائنس ہے۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید میں مصر کے مشہور و معروف عالم طنطاوی کے نزدیک ساڑھے سات سو آیتیں ایسی موجود ہیں جن میں علوم طبعیہ کے مسائل کی طرف واضح اشارات ملتے ہیں۔ (تفسیر جواہر، ج ۷ ص ۷۷)

قرآن کریم نے موجودات کے اسرار و رموز کی کھوج کرنے کی جانب انسانی ذہن کو توجہ دلانے کا ایک لطیف طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اس کی بہت سی آیتوں میں تتمہ کلام علم اور عالم کا تذکرہ قرار دیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل دو آیتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاجْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ۔

”اور اس کے وجود کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، تمہارے جدا جدا ناک نقشے، تمہاری الگ الگ زبانیں ہیں۔ ان چیزوں میں خدا کے علم و حکمت کی نشانیاں ہیں تمام عالموں کے واسطے۔“

(سورہ روم: ۲۲)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ
الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَمُحَرَّرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا
وَعَرَائِبٌ سَوْدٌ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالْدَّوَابِّ

طرف اسی مقصد کے حاصل کرنے کی غرض سے، اسی شعبہ میں ذہن انسانی کے خوب تیز کرنے کے لئے وہ کبھی زمین و آسمان اور ستاروں کی منظم خلقت میں غور و خوض کرنے کی دعوت دیتا ہے، کبھی پودوں، جانوروں اور پہاڑوں کے دامن میں چھپے ہوئے بھیدوں کی طرف واضح اشارے کرتا ہے۔ اسی قرآن میں کہیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ بادلوں، بارشوں، سمندروں اور ہواؤں کے وجود کی مصلحتیں بتائی جا رہی ہیں، کسی جگہ پر بیان ہو رہا ہے کہ چاند، سورج، ستاروں، دن رات، ماہ و سال اور گردش زمین کی پیدائش کا فلسفہ کیا ہے، کبھی خصوصی طور پر انسان کی خلقت کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، اُسے ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ اپنی منزل کمال تک کیونکر پہنچے۔ اس بات کا کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن مجید فرس، کیمسٹری اور نیچرل سائنس کی کتاب نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی ایسا سورہ ہو جس میں اس عالم خلقت کے اسرار و رموز کی طرف معنی خیز اشارے نہ کئے گئے ہوں، جن کا انطباق اسی نیچرل سائنس کے مسائل پر ہو سکتا ہے۔ البتہ قرآن مجید کا مقصد اصلی یہی ہے کہ لوگوں کے دماغ کو خدا کی عظمت و قدرت اور اس کے علم و حکمت کی جانب متوجہ کیا جائے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ انسان اس عالم کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے، ان موجودات کے مقاصد اور فوائد، اُن

وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلَفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۚ (سورہ فاطر: ۲۷-۲۸)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یقیناً خدا نے آسمان سے پانی برسایا، اس کے ذریعہ ہم نے طرح طرح کے پھل پیدا کئے، اسی زمین میں رنگ رنگ کے پہاڑی راستے ہیں، سفید سفید، لال لال اور کالے کالے بھھوکا جیسے، گونا گوں آدمیوں، چوپاؤں اور مویشیوں کو بھی ہم ہی نے پیدا کیا، یونہی ہمارے بندے بھی کئی قسم کے ہیں، خدا سے بس دانشور اشخاص ہی ڈرتے ہیں۔“

ان مذکورہ دو آیتوں میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا جاننا نیچرل سائنس ہی کا ایک شعبہ ہے، کیونکہ کیمسٹری ہی کا فن یہ بتاتا ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن سے پانی کیونکر تیار ہوتا ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے اثرات و خواص کیا ہیں۔ علم النبات (Botany) سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے طرح طرح کے پودے کیونکر اُگتے اور ان سے رنگ رنگ کے پھل کیونکر ہاتھ آتے ہیں جیولوجی (Geology) ان سربفلک پہاڑوں کے سبب خلقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، وہی ان کے وجود کا فائدہ بتانے کا ذمہ دار ہے، ان پتھروں کے الگ الگ رنگ ہونے کی علت کیا ہے؟ انسانوں اور جانوروں کی نسل کے اختلاف کا فلسفہ کیا ہے؟ ان کی شکلوں اور رنگتوں کے گونا گوں ہونے کا سرچشمہ کیا ہے؟ ان کی صلاحیت کے فرق کا موجب کیا ہے؟ ان تمام

سوالوں کا جواب بس زولوجی (Zoology) اور انٹروپولوجی (Anthropology) کا علم دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو آیتوں میں ”علماء“ سے مراد اگر وہی طبقہ قرار دیا جائے جس کو رسمی طور پر ”علماء دین“ کہا جاتا ہے تو ان کا تہمتہ اپنے قبل کے مضمونِ آیت سے غیر مربوط ہو جائے گا۔ اس کے مراد وہی لوگ ہیں جو موجوداتِ عالم کے اسرار و رموز سے باخبر ہیں، جنہوں نے اسی راستے پر چل کر وجودِ خدا کو مانا ہے اور اس کی بارگاہ میں سر نیاز جھکایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہی نیچرل سائنس ایسا علم ہے جس میں اس دنیا کے مادی موجودات کی خاصیتوں اور ان کے درمیانی تعلقات کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ان آیتوں میں ضمنی طور پر جو علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اس کا تعلق انسان کے سائنسی معلومات سے ہے، لیکن بس ایسے معلومات جن کے حصول کا مقصد خدا کی معرفت ہو، نہ کہ مقصد حصول صرف دنیا کے محدود فائدے ہوں۔

احادیث سے کیا پتہ چلتا ہے؟

قرآن مجید کے دائرے سے نکل کر جب حدیث تک بات پہنچتی ہے تو پیغمبر اسلامؐ اور دیگر راہنمایان دین کے ارشادات راہنمائی کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا فرمان ہے:

”اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْبَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ“

”علم طلب کرو اپنے گہوارے سے اپنی قبر تک۔“

مقصود یہ ہے کہ زمانے کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔
چاہے بچپنا ہو، چاہے جوانی ہو اور چاہے بڑھاپا، ہر حصہ
عمر میں علم حاصل کرنا انسان کا فرض ہے۔

کبھی ارشاد فرمایا:

”أَطْلَبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ۔“

”علم حاصل کرو چاہے اس کام کے لئے تمہیں چین

جانا پڑے۔“

اگر علم سے مراد یہی رسمی علم دین ہوتا، جسے ہم آپ
”علم دین“ کہتے ہیں تو اس کا مرکز اس علم کے صادر
ہونے کے وقت مدینہ منورہ تھا، جہاں پیغمبر اسلام
تشریف فرما تھے، اس لئے مناسب یہ تھا کہ یوں ارشاد
فرمایا جاتا کہ ”أَطْلَبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ مِنَ الصِّينِ“ علم
طلب کرو، خواہ اس کے لئے چین سے آنا پڑے۔“

امیر المومنین علی ابن طالبؓ سے فرمایا:

الحكمة ضالة المؤمن، فخذ الحكمة ولو من

اهل النفاق۔

”ہر مضبوط و مستحکم بات مومن کی گم شدہ چیز ہے، لہذا
اسے حاصل کرو چاہے وہ منافقین کے پاس ہو۔“

دوسرے لفظوں میں یوں فرمایا:

خذ الحكمة اتي كانت۔ ”مضبوط و مستحکم بات

کہیں بھی ہو اسے اپنے قبضہ میں کرلو۔“ (کلمات قصار)

اسلام میں اولاد کے جو حقوق ان کے باپ کے ذمہ
قرار دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک واجب الادا حق

یہ بھی ہے کہ وہ ان کی تعلیم کا انتظام کرے۔ پیغمبر اسلام
نے فرمایا کہ باپ پر اس کی اولاد کے تین حق ہیں۔ پہلا
حق یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اچھا سا نام تجویز کرے،
دوسرا حق یہ ہے کہ اس کو لکھنا پڑھنا سکھائے، تیسرا حق یہ
ہے کہ جب از دواج کے قابل ہو جائے تو شادی کا انتظام
کرے۔ (مکارم الاخلاق، ص ۱۱۶)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ان حقوق کے
لحاظ سے بیٹے اور بیٹی کے درمیان کوئی فرق نہیں قرار دیا
ہے، کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ لڑکوں کی طرح
لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ان کے باپ کو انتظام کرنا چاہئے،
البتہ اسلامی حدود سے قدم باہر نہ نکلتا چاہئے۔ اس کے
علاوہ تحصیل علم کے سلسلے میں عورت اور مرد کے درمیان
صریحی طور پر نظر آتا ہے کہ اسلام نے کوئی فرق نہیں قرار
دیا ہے۔ آنحضرتؐ کا شہرہ آفاق ارشاد ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ
وَمُسْلِمَةٍ۔

”علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا فریضہ
ہے۔“ (معالم الدین)

اختیاری ہی نہیں، بلکہ اجباری تعلیم

حقیقت یہ ہے کہ صرف اخلاقی نصیحتوں کے ذریعہ
عمومی طور پر لوگوں کو تعلیم یافتہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس
مقصد کے حصول کے لئے حکومتوں کی مشینری کو حرکت
میں آنا چاہئے، اُن کا فریضہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی

زبردست طاقت کے ذریعہ تعلیم کو ہمہ گیر اور عمومی بنائیں۔ کم از کم ابتدائی، بنیادی تعلیم حاصل کرنا ان کی طرف سے جبری قرار پانا چاہئے۔ کیونکہ تقریباً ہر سماج میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو باوجودیکہ کسی کام کے ضرر اور نقصان کے پہلوؤں سے بخوبی واقف ہیں، لیکن ان کے بالمقابل کچھ دوسرے خیالی اور موبوم فائدے ان کی نظر میں ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھتے ہوئے وہ شوق سے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو خوب جانتے ہیں کہ فلاں کام کتنا فائدہ مند ہے، اس کے نتائج کتنے خوشگوار اور خوش آئند ہیں، مگر اس کے باوجود کاہلی، سستی، جسم پروری اور ایسی ہی دوسری رکاوٹوں کی بنا پر وہ اس کے انجام دینے سے گریز کرتے ہیں، اس لئے جس طرح کسی مفید کڑوی دوا کو زبردستی بیماروں کے حلق سے نیچے اُتارنا اور انہیں ان کی ایسی پسندیدہ غذائیں نہ دینا ضروری ہے جو ان کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہوں، اسی طرح اس سے ملتے جلتے مقامات پر حکومت اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ عمومی مصلحتوں کو لحاظ کرتے ہوئے، سماجی عدالت و انصاف کے تحفظ کی خاطر لوگوں کی سطح ذہن بلند کرنے کی غرض سے اپنی مخصوص قوت اور طاقت سے فائدہ اُٹھائے۔ یہی راز ہے کہ ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلام نے ایک طرف لوگوں کو نہایت پر زور طریقہ سے علم حاصل کرنے کا شوق دلایا، دوسری طرف

اس کے راستہ میں جو رکاوٹیں موجود تھیں، انہیں ہٹانے کی بھرپور کوشش کی، تیسری طرف اس نے اپنی حکومت، بلکہ اصولی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہر برسر اقتدار حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی جہالت سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے:

ایہا الناس ان لی علیکم حقاً ولکم علی حق فاما حقکم علی فالنصيحة لکم وتوفیر فیئکم وتعلیبکم کیلا تجھلوا وتادیبکم کما تعلیموا۔

”اے لوگو! میرا تمہارے اوپر اور تمہارا میرے اوپر ایک حق ہے، تمہارا میرے اوپر حق یہ ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی کرتا رہوں، تمہیں نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھوں، قومی سرمایہ سے زیادہ تمہیں فائدہ پہنچاؤں اور تمہاری تعلیم و تربیت کی پوری پوری کوشش کروں، تاکہ تم جاہل اور غیر تربیت یافتہ نہ رہو۔“

(شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید، ج ۲ ص ۱۸۹)

معلوم ہوا کہ حکومت اسلامیہ کو تعلیم و تربیت کا صرف علمبردار ہی نہ ہونا چاہئے، بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے اور ہر طرح کی جہالت سے مقابلہ کرنے میں اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا دے، ایسے انتظامات کرے کہ افراد قوم مفت تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں، وہ اس اپنے مقصد کو

حاصل کرنے میں کسی رُخ اور کسی زاویہ سے اسلام دشمن عناصر کے محتاج نہ ہوں، ورنہ خود مسلمان باطل کے ہاتھوں کو مضبوط کریں گے، انھیں طاقتور بنانے کا سبب بنیں گے جو قانونِ اسلامی کے خلاف، یعنی حرام ہے۔

پیشوایانِ اسلام کا مثالی رویہ

قرآن وحدیث کے علاوہ راہنمایانِ اسلام کی سیرت طیبہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام تمام ایسے علوم کا طرفدار ہے جو مسلمانوں، بلکہ تمام انسانوں کے سماج کے لئے فائدہ مند ہوں، بشرطیکہ انکا رابطہ کسی نہ کسی زاویہ سے خدا کی ذات سے قائم ہو جائے، وہ علوم خواہ فزکس، کیمسٹری، ریاضی، جیولوجی، انتھروولوجی، سائیکولوجی کے نام سے یاد کئے جائیں، یا انھیں تفسیر، حدیث، تاریخ اور عقائد کہا جائے۔

یہ جاننے کے لئے کہ پیشوایانِ اسلام نے بلا استثناء تمام مفید علوم وفنون کے حاصل کرنے کی طرف افرادِ انسانی کو متوجہ کیا ہے، صفحاتِ تاریخ سے چھانٹ کر چند مندرجہ ذیل نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جب جنگ بدر کا خاتمہ مسلمانوں کی فتح اور کامیابی پر ہوا تو مشرکین کی ایک جماعت اسیر بنا کر مدینہ لائی گئی۔ ان کے درمیان کچھ ایسے نادار اشخاص بھی تھے، جن کے پاس اپنے کو آزاد کرانے کے لئے روپیہ نہیں تھا، لیکن وہ پڑھ لکھے لوگ تھے۔ ان کے برعکس مدینہ کے مسلمانوں، یعنی جماعت انصار کے درمیان کوئی

ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ اس صورت حال میں پیغمبر اسلامؐ نے حکم دیا کہ ان قیدیوں میں سے ہر ایک دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر اپنے آپ کو آزاد کرا سکتا ہے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے حکم کو مانتے ہوئے اسی کے مطابق عمل کیا، چنانچہ زید ابن ثابت انصاری نے اسی پیغمبر اسلامؐ کے قائم کردہ مکتب میں لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ (جہان اسلام، ص ۶)

۲۔ صحیح بخاری میں انہی زید ابن ثابت کی ایک روایت نقل کی گئی ہے:

ان کا بیان ہے کہ کچھ صحابہ کے ہمراہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ میرے ساتھیوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ یہ شخص ”بنی نجار“ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے قرآن مجید کے سترہ سو رے یاد ہیں، چنانچہ میں نے پیغمبر اسلامؐ کے حضور میں ان سورتوں کی تلاوت کا شرف حاصل کیا، جنھیں سن کر آنحضرتؐ خوش ہوئے اور مجھے حکم دیا کہ میں یہودیوں کی زبان اور ان کے خط کو سیکھوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ان کی دیانت داری پر بھروسہ نہیں ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں ان سے کام لوں تو کہیں میرے خطوط میں اپنے مفید مطلب کوئی تحریف نہ کر دیں، میں کچھ بولوں اور وہ لکھ کچھ دیں۔ زید ابن ثابت کہتے ہیں میں نے حکم رسولؐ کی تعمیل کرتے ہوئے بہت تھوڑے عرصہ میں سریانی خط کو سیکھ لیا اور میں کاتب رسولؐ قرار پا گیا۔ میں

سریانی رسم الخط میں یہودیوں کے نام پیغمبر اسلام کے خطوط لکھنے لگا، نیز آنحضرتؐ کے نام جو ان کے خطوط آتے تھے میں ہی ان کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا کرتا تھا۔^(۱) (نجر الاسلام، ج ۱ ص ۱۴۲)

۳۔ تاریخ ان کثیر التعداد اشخاص کی نشاندہی کرتی ہے جنہوں نے ائمہ اہلبیتؑ سے کسب فیض کیا انہی میں سے ایک جابر ابن حیان کی ممتاز شخصیت تھی، جو حضرت امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہیں علوم طبیعیہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے قلمی آثار کے متعلق مورخین کسی ایک نقطہ پر متفق نہیں ہیں۔ بعض نے ان کی تعداد ۲۳۲ اور بعض نے ۳۹۰۰ تک بتائی ہے۔ (اعیان الشیعة، ج ۱۵)

اگرچہ جابر ابن حیان کی بہت سی کتابیں تلف ہو گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی بہت بڑی تعداد دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہے۔ ان میں سے بعض کتابوں کا زندہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے جن سے یورپ کی قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان کتابوں میں سے ایک کا نام ”نتائج التکمیل“ ہے جس ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۶۷۲ء میں کیا جا چکا ہے۔

(۱) اس واقعہ سے یہ تصور نہ ہونا چاہئے کہ معاذ اللہ آنحضرتؐ قرأت و کتابت نہیں جانتے تھے، کیونکہ عدیم الفرست اشخاص کے یہاں منشیوں اور کاتبوں کے رکھے جانے کا رواج عام ہے۔ اس کے علاوہ قرأت و کتابت سے واقفیت کا اظہار قرآن کی مصلحت اعجاز کے لئے مضرت تھا، اس لئے حضرت خود نہیں لکھتے پڑھتے، بلکہ دوسروں سے لکھواتے اور پڑھواتے تھے۔

جابر ابن حیان کو ”کیمسٹری کا باپ“ کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے جرجی زیدان نے مندرجہ ذیل گرانقدر الفاظ لکھے ہیں:

هو الحجة الشرقي على الغربي الى ابد الدهر۔ (ان کی شخصیت یورپین اشخاص کے اوپر مشرقی لوگوں کی فوقیت کا ایک ابدی اور جاودانی نشانی ہے)۔ صرف یہی نہیں کہ جابر ابن حیان کے پاس کیمسٹری، فرزکس اور باٹنی کے وسیع معلومات تھے، بلکہ انہیں اپنے زمانے میں بہت سے علوم و فنون کے لحاظ سے امتیاز حاصل تھا۔ اسی لئے ان کا لقب ”پدرِ کیمیا“ قرار دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر گوٹا وے لیبون (Gustave. Dr Lebon) ان کے متعلق لکھتے ہیں:

”علماء اسلام میں سب سے مشہور اور سب سے مقدم جابر ابن حیان ہیں۔ ان کے تصانیف ایک سائنسی دائرۃ المعارف (Encyclopedia) کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے تمام کیمیائی مسائل پر حاوی ہیں۔ ان کتابوں میں ایسے ترکیبات (Compounds) کا ذکر ہے جو پہلے کسی کو معلوم نہیں تھے۔“

(تمدن اسلام و عرب، ص ۶۱۲-۶۱۴)

جابر ابن حیان کی اس عظیم شخصیت کے متعلق قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ تمام مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ انہوں نے یہ تمام سائنسی معلومات حضرت امام جعفر صادقؑ سے

حاصل کئے تھے۔ ان کے تمام تصنیفات حضرت کی نگرانی میں مکمل ہوئے ہیں۔ ان کے نوشتہ جات میں کبھی آپ کچھ بڑھادیے اور کبھی کچھ کم کر دیتے تھے۔

(الامام الصادقؑ ملہم الکیمیاء، ج ۴)

۲۔ صحت اور تندرستی

انسان کے پاس سب سے بڑا سرمایہ صحت اور تندرستی ہے۔ اسلام ہر طرح کی بیماری سے جنگ کرتا ہے۔ وہ فلاسفہ یونان کا ہم خیال نہیں ہے جو انسان کی خوش بختی کا دار و مدار صرف اس کے نفسانی فضائل و اخلاق کو قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ شخص خوش قسمت ہے جس کی ذات میں یہ فضائل پائے جاتے ہیں، چاہے وہ اس کے ساتھ تمام جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو۔

(طہارة الاعراق لابن مسکویہ، ص ۷۸)

چونکہ اسلام انسان کی صحت اور تندرستی کا خواہاں ہے، اس لئے اس نے پیش بندی اور احتیاط کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس نے حفظانِ صحت کے لئے ایسے جاودانی اصول بتائے ہیں۔ جنہیں ملحوظ رکھنے کے بعد انسان بیمار ہی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ خدا نے احکامِ شرعیہ کی ذمہ داری ایسے شخص پر ڈالی ہے جو عقلِ سلیم رکھتا ہو اور عقلِ سلیم اسی کے پاس ہو سکتی ہے جو جسمانی طور پر صحیح و سالم ہو، اسی لئے خدا کی حکمت و رحمت کا تقاضہ ہے کہ قرآن مجید اور راہنمایانِ دین لوگوں کو ان کی جسمانی صحت کی طرف متوجہ کریں، بلکہ اس کے لئے ویسا ہی اہتمام کیا جائے

جیسا کہ احکامِ شرعیہ کے واسطے کیا گیا، کیونکہ ان کی بجا آوری لوگوں کی صحت پر موقوف ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اپنی ایک چھوٹی سی آیت میں حفظانِ صحت کے تمام راہنما اصولوں کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے، ایسے اصول کہ جن تک بڑے بڑے اطباء اور فلاسفہ کے دماغ بہت سی صدیاں گزر جانے کے بعد پہنچے ہیں۔

ارشادِ قرآنی ہے: ”کسی بھی مسجد میں جاتے وقت اپنے کو سنوار لو، تم ضرور کھاؤ اور پیو، لیکن بے اعتدالی نہ کرو، کیونکہ خدا بے اعتدالی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔“ (سورۃ اعراف: ۳۱)

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: ”معدہ ہر بیماری کا گھر، پرہیز تمام دواؤں کے سرفہرست ہے اور ہر جسم کو ایسی چیز پہنچاؤ جس کا اسے عادی بنایا گیا ہے۔“

(طب الامام الصادقؑ)

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا: ”بھوکے دسترخوان پر بیٹھو اور بھوکے اس سے اٹھو، لقمہ کو اچھی طرح چباؤ، جب سونے کا ارادہ کرو تو پہلے استنجا کر لو۔ اگر تم ان باتوں پر عمل کرو گے تو تمہیں کسی حکیم ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ (طب الامام الصادقؑ)

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ”تین ایسی چیزیں ہیں کہ وہ جس شخص میں بھی ہوں خدا اس سے نفرت کرتا ہے۔ (۱) رات کو بغیر جاگے ہوئے، دن میں سونا (۲) بے محل اور بے موقع ہنسنا (۳) پیٹ بھرے ہونے

کے باوجود کھانا کھانا۔“ (طب الامام الصادق)
نیز انہی حضرت کا ارشاد ہے: ”ناوقت کوئی چیز نہ
کھاؤ کہ اس سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔“

(طب الامام الصادق)
ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں شکایت کی کہ
میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے اور معدہ ٹھیک کام نہیں
کرتا۔ یہ سن کر امامؑ نے ہدایت فرمائی: ”بس دو وقت
کھانا کھانے کے لئے مقرر کر لو، صبح اور شام۔ ان کے
درمیان ہر گز منہ نہ جھٹلاؤ۔“ (طب الامام الصادق)
ایک عام، ہمہ گیر ابدی اصول کے طور پر آپ
نے فرمایا: ”لوگ اگر اپنے کھانے پینے میں اعتدال
سے کام لیں تو ان کی جسمانی صحت بالکل ٹھیک رہے۔“
اب اگر کوئی شخص بیمار ہی پڑ جائے تو اُسے فوراً حکیم
ڈاکٹر کے پاس نہ چلا جانا چاہئے۔ خداوند عالم نے ہر
شخص کے خود جسم میں بیماری کو دور کرنے کی قوت و دیعت
فرمائی ہے، اسے بیماری سے مقابلہ کرنے کا موقع دینا
چاہیے۔ اس سلسلے میں امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ
نے فرمایا: ”بیماری سمیت تمہیں چلتے پھرتے رہنا
چاہئے جب تک وہ تمہیں چلا پھرا سکے۔“

(نہج البلاغہ، کلمات قصار)

اسی سے ملتی جلتی بات حضرت امام جعفر صادقؑ نے
فرمائی:

”جب تک تمہارا جسم بیماری کو برداشت کر سکے

دوا کھانے سے پرہیز کرو۔“ (طب الامام الصادق)
یہ مریض کی صحت و سلامتی کا مقدم کرنا نہیں ہے تو کیا
ہے کہ اسلام نے انسان کو اجازت دے دی ہے اگر
ضروری ہو تو وہ ہر طرح کے واجبات شرعیہ ترک کر سکتا
ہے۔ اس کی طرف سے بیماری سفر اور بڑھاپے کے
زمانے میں انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ روزہ نہ
رکھے، بلکہ اگر نقصان کرنے کا ڈر ہو تو اتنا ہی نہیں کہ روزہ
واجب نہیں، بلکہ وہ شرعی طور پر حرام ہو جاتا ہے۔ حج اسی
صورت میں واجب ہوتا ہے، جب کہ آدمی کی صحت
اجازت دے کہ مکہ معظمہ جا کر حج بجالا سکتا ہو۔ یہ سب
کچھ اسی لئے ہے کہ اسلام کی نظر میں انسان کی صحت اور
تندرستی اس کا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ شخص بڑا خوش
قسمت ہے جس کے پاس تندرستی کی نعمت ہو۔ بغیر اس
کے آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ تحصیل علم تندرستی چاہتی ہے،
محنت و مزدوری تندرستی چاہتی ہے، راہِ حق میں جہاد تندرستی
کا طالب ہے۔ اسلام اس سلسلے میں اتنا آگے بڑھا کہ
اس نے انسان کی جسمانی صحت کو دین کی صحت و سلامتی کا
پیشِ نیمہ قرار دے دیا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان
جس طرح بھی بیماری کو دور کر سکتا ہو، دور کرے۔

۳۔ اطمینان اور خوش حالی

اسلام ہر گز اپنے ماننے والوں کو کسی بھی وجہ سے
تنگدست اور پریشان حال نہیں دیکھنا چاہتا۔ پریشان
حالی اور تنگدستی کے گونا گوں اسباب ہیں۔ اسلام نے اُن

سب کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ دنیا سے بے تعلق: اسلام کے نزدیک انسانیت کے دو پہلو ہیں، ایک مادی اور دوسرا روحانی۔ جس طرح انسان کی روحانی صلاحیتوں کے ارتقا کے لئے مخصوص اعتقادات اور اخلاقیات کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کے مادی پہلو کے پھلنے پھولنے کے واسطے مخصوص کاموں اور گوشوں کی ضرورت ہے۔ اگرچہ انسان کی طویل تاریخ زندگی کے مطالعے اور روزمرہ کے مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ان پہلوؤں کے لحاظ سے کبھی حدِ اعتدال سے آگے بڑھ گیا ہے اور کبھی پیچھے رہ گیا ہے۔ کسی دور میں تمام انسانوں نے راہِ اعتدال اختیار نہیں کی ہے۔ ایک طرف تارک الدنیا، رہبانیت پسند افراد کا گروہ ہے جس نے انسان کے جسمانی اور مادی پہلو کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لی ہیں۔ ان لوگوں کی گزر بسر کا ذریعہ جنگلوں میں خود بخود اُگ آنے والے پودے، اُن کے پھل اور پھول پتیاں ہیں۔ وہ اپنے جسم موٹے جھوٹے پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھانک لیتے ہیں۔ ان کا کوئی مخصوص گھر نہیں ہے۔ جہاں سر چھپانے کے لئے جگہ پائی، وہیں رہنے سہنے لگے۔

یہ طبقہ اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ وہ انسان کی خوش بختی کی بنیادی شرط ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے جسم کو تکلیفیں پہنچائے۔

اس کا خیال ہے کہ جتنا جتنا جسمانی خواہشوں کو گچلا

جائے گا، جتنا جتنا اس دنیا کی نعمتوں سے منہ موڑا جائے گا اُتنا اُتنا روح کا درجہ ارتقاء اونچا ہوتا جائے گا، انسان کی سعادت اور خوش قسمتی کے سرمائے میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس طبقہ کے نزدیک روح کے طاقتور بنانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس کی نظر میں وہ لوگ حقیر اور ذلیل ہیں جو اس دنیا میں رہ کر اپنے مادی ضروریاتِ زندگی کے فراہم کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔ اس طبقہ کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہے جس نے انسان کے روحانی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی پوری توجہ انسان کے مادی پہلو کی طرف ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کا مذاق اُڑاتا ہے جن کا روح اور روحانیت سے تعلق ہے۔

ڈاکٹر اے لیکسس کارل (Lexis. A. Dr)

Carrel) لکھتے ہیں: ”ہم اپنے جسم و روح کی بنیادی ضرورتوں کی طرف توجہ کئے بغیر زمانے کے راستے پر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ ہمیں اس طرح زندگی بسر کرنا چاہئے کہ ہم اپنے فطری تقاضوں کو بھی سمجھیں اور دوسری چیزوں کے فطری تقاضوں کو بھی۔“ (انسان موجودنا شناختہ)

جب کہ انسان مادی اور روحانی دونوں طرح کے فطری میلانات کا مجموعہ ہے تو پھر اس کی خوش قسمتی کا دار و مدار جسم اور روح دونوں کا لحاظ رکھنے کے اوپر ہے۔ کسی ایک کو لے کر دوسرے کو چھوڑ دینا تقاضہ فطرت کے خلاف ہے۔

اسلام کی راہ اعتدال

اسلام ایک ہمدِ گرا اور درمیانی راستے کا نام ہے۔ اس کی تعلیمات میں بے نظیر جامعیت ہے۔ اس نے انسان کے اوپر ان تمام حقیقتوں سے سمیت نظر کی ہے جو اس کے وجود میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس نے اس کے مادی و روحانی، ظاہری و باطنی تمام تقاضوں کا لحاظ کیا ہے۔

قرآن مجید نے مادی لذتوں سے کنارہ کشی کی حمایت نہیں کی ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو پکار کر ہدایت فرمائی ہے:

”اے ایمان لانے والو! پاک و پاکیزہ کھانے کی چیزیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے حلال کر دیا ہے، تم انہیں اپنے اوپر حرام نہ قرار دے لو۔ ایسے ہی جو حلال چیزیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں، انہیں شوق سے نوش جان کرو۔“ (سورہ مائدہ: ۸۷-۸۸)

قرآن کریم نے یہ عام اصول دنیا کو بتایا ہے کہ پختہ ایمان اور سچا دین انسان کو دنیا میں بھی خوش حال بنانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کی آیتوں سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ مومن ہونے کا نتیجہ ہی یہ ہے کہ انسان دنیوی لحاظ سے بھی خوشحال ہو اور اخروی لحاظ سے بھی۔

”اور اگر اس زمین پر بسنے والے ایمان لے آتے، نیز اس کے احکام کی پیروی کرتے تو زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے ہم اُن کے لئے کھول دیتے، لیکن انہوں نے دل کھول کر حقیقتوں کو جھٹلایا تو ہم

نے بھی ان کی بدکرداری کی وجہ سے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔“ (سورہ اعراف: ۹۶)

قرآن انسان کی بد اعمالیوں سے باز آ جانے کے عزم اور مضبوط ارادے کو خدا کی نعمتوں کے نازل ہونے کا موجب قرار دیتا ہے:

”اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے اپنی بخشش کی بھیک مانگو، پھر اپنے کرتوت پر پشیمان ہو کر اپنے دل میں ٹھان لو کہ اب گناہ نہیں کرو گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تمہارے لئے برستے ہوئے بادلوں کو بھیجے گا، تمہاری طاقت کو بڑھادے گا، تم مجرم اور گناہگار بن کر اس کی طرف سے منہ نہ پھراؤ۔“ (سورہ ہود: ۵۲)

اسلام وہ دین ہے جس کے نزدیک پریشاں حالی اور تنگدستی یا خدا سے منہ پھیر لینے کا نتیجہ ہے:

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

پس جو شخص میری ہدایت کے راستے پر چلے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بد بخت، اس کے برخلاف جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا، وہ یقیناً بہت تنگی کے ساتھ زندگی گزارے گا۔“ (سورہ طہ، ۱۲۸-۱۲۹)

اسلام صحیح آسمانی ادیان میں آخری دین ہے۔ اس نے انسان کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا لحاظ کرے۔ اسی صورت میں وہ بہتر زندگی بسر کر سکتا اور اس کی کشتی حیات افراط و تفریط کے تباہ کن طوفان سے بچ سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی نظر میں اس دنیوی زندگی کے تمام دل کش جلوے ناپائیدار اور وہ روحانی اقدار کے مقابلے میں ناقابلِ توجہ ہیں۔ اس کے برخلاف آخرت کا سرمایہ زندگی پائیدار اور انتہائی قیمتی ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے: ”اور یہ دنیوی زندگی تو بس کچھ دن کا ایک کھیل ہے، اگر لوگوں کی سمجھ میں آئے تو زندگی بے شک آخرت کی زندگی ہے۔“ (سورہ عنکبوت: ۶۴)

اس واقعیت اور حقیقت کے باوجود قرآن کا نقطہ نظر یہ ہے:

”اور جو خدا نے تجھے عطا کر رکھا ہے اسی کے بچوں بچ آخرت کے گھر کا بھی دھیان رہے اور دنیا میں تیرا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے، اسے بالائے طاق نہ رکھ، اللہ نے جس طرح تیرے ساتھ بھلائی کی ہے ویسے ہی تو بھی دوسرے کے ساتھ بھلائی کر، خدا کی زمین میں فساد نہ کرتا پھر، کیونکہ بے شک وہ اس کو پسند نہیں کرتا ہے۔“ (سورہ قصص: ۷۷)

قرآن کے بعد حدیث

پیغمبر اسلام کو بتایا گیا کہ عثمان ابن مظعون، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ ابن مسعود اور قدامہ نے اچھی چیزیں کھانا پینا چھوڑ دی ہیں، وہ عورتوں سے دور رہتے ہیں اور دوسری خوشگوار چیزوں سے انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ دن میں روزے رکھتے اور راتوں کو نہیں سوتے ہیں۔

جس طرح پادری اپنے گرجا میں اسی طرح یہ لوگ خاص خاص جگہوں پر بس عبادتِ خدا کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ حضرت نے ان کی حالت سن کر قرآن کی یہ آیت پڑھی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْزَنْمُوا طِبِّبْتُمْ مَآ أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ۔ (سورہ مائدہ: ۸۷)

پھر مزید ارشاد فرمایا: ”میں روزہ رکھتا اور اس کو نمانہ بھی کر دیتا ہوں۔ نماز پڑھتا اور اس کے ساتھ سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے الگ بھی نہیں رہتا ہوں۔ تم سے پہلے ایسے لوگ ہلاک ہو گئے جو بلا وجہ اپنے کو زحمت اور مشقت میں مبتلا کرتے تھے۔

ایسے اشخاص اب بھی تمہیں گرجاؤں میں دکھائی دیں گے اس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں جو عورتوں سے علیحدہ رہے اور ترکِ لذات کے نقطہ نظر سے گوشت نہ کھائے، لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دے، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔“

امیر المومنین علی ابن ابی طالب کو اطلاع دی گئی کہ عاصم ابن زیاد تارک الدنیا ہو گئے ہیں۔ آپ نے بڑی سختی کے ساتھ ان سے فرمایا:

تم اپنی جان کے دشمن ہو گئے ہو، گمراہ کن خیالات تمہارے ذہن پر چھا گئے ہیں۔ تمہیں کیوں نہیں اپنے بال بچوں پر ترس آتا۔ تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ خدا کو

یہ پسند نہیں ہے کہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ جو اس نے تمہیں دے رکھی ہیں۔“ (نچ البلاغہ)

ابن ابی یعفور کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے کہا: ”خدا کی قسم میں طالب دنیا ہوں۔“

حضرت نے دریافت کیا: ”دنیا کے حاصل کرنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟“

اس شخص نے کہا: ”میرا مقصد یہ ہے کہ میرے بال بچے دوسروں کے محتاج نہ ہوں میں چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کروں، خدا کی راہ میں خیرات دوں، حج و عمرہ بجالاؤں۔“

یہ سن کر حضرت نے فرمایا: ”یہ طلب دنیا نہیں، بلکہ طلبِ آخرت ہے۔“ (فروع کافی، ج ۵)

نیز انہی بزرگوار کا ارشاد ہے: ”دنیا آخرت کی بہترین یار و مددگار ہے۔“ (فروع کافی، ج ۵)

محمد ابن نصر کہتے ہیں کہ حضرت امام علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا کہ اچھی اور خوشنما پوشاک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے اس طرح بتایا گیا ہے کہ حضرت امام حسنؑ اچھی پوشاک پہنتے تھے اور حضرت امام جعفر صادقؑ نئے نئے کپڑے خرید کر انھیں زیب جسم کرتے تھے۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا:

”عمدہ اور خوشنما لباس پہنو، کیونکہ حضرت امام زین

العابدینؑ ایسا جبہ پہنتے تھے جس کی قیمت پانچ سو درہم تھی اور اسی طرح پچاس دینار کی قیمتی عبا اوڑھتے تھے۔ جب جاڑے کا موسم گذر جاتا تو اسے بیچ ڈالتے اور اس کی قیمت راہِ خدا میں خیرات کر دیتے تھے۔“

(وسائل الشیعہ، ج ۱)

خلاصہ یہ کہ اسلام صرف یہی نہیں کہ دنیوی تعلقات کے برقرار رکھنے اور خالص مادی جذبات کی پیاس بجھانے کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اعتدال اور توازن قائم رکھنے کی صورت میں اس کو انسان کی خوش قسمتی کا ایک اہم سبب قرار دیتا ہے۔

البتہ وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنے کو محدود لذتوں اور مادی میلانات کی چار دیواری میں اسیر کر لے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کا مفہوم بس کھانا پینا، رہنا اور پہننا قرار پا جائے۔ دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اسلام کی نظر میں مادی خواہشوں کو پورا کرنا اس حد تک جائز ہے جو اس کے لئے کسی پہلو سے ضرر رساں نہ ہو، وہ سماج کو گندہ اور آلودہ نہ بنائے۔ یہ ہے دین و دنیا کے سلسلے میں وہ درمیانی، معتدل اور متوازن راستہ جس پر اسلام انسانی قافلہ کو چلانا چاہتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دنیا کو اسی زاویہ نظر سے دیکھیں اور اپنی عملی زندگی میں اس کی پابندی کریں۔

۲۔ کاہلی اور نکتہ پن: اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا اور دین کو یکجا کر کے ایک اعتدال پسند قوم کو وجود میں لائے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو اس طرح محنت و مشقت اور کام کرنے پر آمادہ کرنا چاہا ہے جس کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس کا اعلان ہے کہ خدا ایسے اشخاص سے بغض رکھتا ہے جو محنت نہیں کرتے اور نکتے ہیں، جن کا مستقل شعار کاہلی اور سستی ہے۔ وہ دن رات سوتے اور بیکار گھومتے رہتے ہیں۔

اسلام میں محنت و مشقت کرنے اور اپنی روزی اپنی قوتِ بازو سے کمانے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس نے کبھی تحریف شدہ آسمانی ادیان کی طرح لوگوں کو بیکاری اور کاہلی پر آمادہ نہیں کیا ہے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اپنی اس چند روزہ زندگی میں کمرِ ہمت کس کر کسی نہ کسی کام میں جُٹ جائے، ورنہ جب تک انسان اپنی عمر کی اس مختصر مہلت میں محنت و مشقت نہیں کرے گا، ہرگز ہرگز وہ نہ اس دنیا میں خوش قسمت ہو سکے گا اور نہ اس عالمِ آخرت میں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ”خدا وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے رام کر دیا ہے، تم اس کے کاندھوں پر راستہ چلو اور اس کی روزی سے اپنا پیٹ بھرو۔“

(سورہ ملک: ۱۵)

دوسری جگہ فرمایا: ”پس جب نماز سے فارغ ہو جاؤ

تو زمین میں ادھر ادھر پھیل جاؤ اور خدا کی عنایت سے اپنی روزی تلاش کرو۔“ (سورہ جمعہ: ۱۰)

اسلام کا عقیدہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا ذرہ ذرہ حرکت کر رہا ہے، کوئی چیز بھی ساکن نہیں ہے، اسی طرح انسان جو تمام موجوداتِ عالم کے درمیان اشرف اور ممتاز ہے، اسے محنت و مشقت کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہنا چاہئے۔ اس کے لئے یہ عار و ننگ ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، سماج کے اوپر ایک بوجھ بن جائے۔ پیشوایانِ اسلام نے لوگوں کو محنت و مشقت کرنے کی طرف توجہ دلانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انھوں نے انتہائی سخت الفاظ میں دل کھول کر کاہلی اور سستی کی مذمت کی۔ بہترین انداز سے انھیں کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ”خدا کی رحمت سے وہ شخص محروم اور دور ہے جو لوگوں کے کاندھوں پر اپنی گزر بسر کا بوجھ ڈال دے۔“

”جو شخص اپنے بال بچوں کے لئے محنت و مشقت کر کے حلال روزی حاصل کرے وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کے مانند ہے۔“

(فروع کافی، ج ۵)

ایک دن آنحضرتؐ اپنے اصحاب کے ہمراہ ایک

کھیت کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طاقتور جوان اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے اُس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا جو دین کے حقیقی مفہوم کو نہیں سمجھا تھا کہ کاش یہ جوان جو جان توڑ محنت اپنی دنیا بنانے کی خاطر کر رہا ہے، اسے اپنی آخرت کو سنوارنے کے واسطے کرتا۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا: ”تم سے بڑی چوک ہوگئی، کیونکہ اگر یہ جوان اس لئے محنت کر رہا ہے کہ اپنی روزی اپنے کذبیمین سے حاصل کرے، دوسروں کے کاندھے کا بوجھ نہ بنے، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے تو اس کی یہ محنت خدا کی بہت بڑی عبادت ہے۔ اگر اس کی نیت یہ ہے کہ مالِ دنیا حاصل کر کے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرے گا، بیوہ عورتوں، اذکار رفتہ بوڑھوں اور یتیم بچوں کی خبر گیری کرے گا تو خدا اسے روزِ قیامت پیغمبروںؐ کی صف میں قرار دے گا، لیکن اگر اس محنت و مشقت کا مقصد یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے کے بعد دوسرے لوگوں پر فخر کرے تو اس کی پوری عمر شیطان کی عبادت میں گزرے گی۔“ (دستوراتِ زندگی)

جب یہ آیہ قرآنی نازل ہوئی ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ“ تو بعض اصحابِ رسولؐ نے اپنی دوکانیں بند کر دیں اور خدا کی عبادت میں لگ گئے، وہ کہنے لگے کہ خدا ہماری گزر بسر کا ذمہ دار ہو گیا ہے۔ جب یہ خبر آنحضرتؐ تک پہنچی تو

آپ نے ان لوگوں کو بلا کر اُن سے فرمایا: کیوں تم نے ایسا رویہ اختیار کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! خداوند عالم نے ہماری روزی کی ذمہ داری لے لی ہے اس لئے ہم نے پورا وقت اس کی عبادت میں صرف کرنا شروع کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ”جو شخص ایسا کرے گا اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ تمہارا فریضہ ہے کہ تم اپنی روزی خود حاصل کرو۔ پھر آپ نے مزید فرمایا: میں اس شخص کا دشمن ہوں جو بس دُعا کے لئے خدا کی بارگاہ میں اپنا منہ کھول دے اور کہے کہ بارالہا: مجھے روزی عطا فرما، وہ خود اپنی روزی تلاش کرنا چھوڑ دے۔ ایسا شخص ملعون ہے، ملعون۔“ (دستوراتِ زندگی)

حضرت امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: ”جو شخص دوسرے اشخاص سے بے نیاز ہونے کے لئے اپنے بال بچوں کے آرام سے بسر کرنے کی خاطر، اپنے پڑوسیوں کی دل جوئی کی غرض سے اس دنیا میں رہ کر اپنی روزی حاصل کرنے کے واسطے اپنے گھر سے نکل کر کہیں روانہ ہو، اس کا چہرہ روزِ قیامت اپنے خدا سے ملاقات کے موقع پر چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکے گا۔“

(کافی، کتاب المعیشتہ)

پانچویں امامؑ نے لوگوں کو متنبہ کیا ہے: ”میں اس شخص کا دشمن ہوں جو دنیا سے متعلقہ کاموں میں کاہلی اور سستی کرے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جو آدمی اپنے دنیوی

کاموں میں کاہلی کرتا ہوگا، وہ بے شک اپنی آخرت سے متعلق کاموں میں زیادہ کاہل اور سست ہوگا۔

(فروع کافی، ج ۵)

امام جعفر صادقؑ نے لوگوں کو غیرت دلاتے ہوئے فرمایا: ”کیا تم لوگ چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور اور پست ہمت ہو۔ یہ چھوٹا سا حقیر جانور انتہائی کوشش کر کے اپنی غذا جوں توں اپنے بل تک پہنچاتا ہے۔ وہ اپنی روزی حاصل کرنے میں رتی بھر کوتاہی نہیں کرتا ہے۔“

(کافی، کتاب المعیشتہ)

نیز آپ کا ارشاد ہے: ”یقیناً زیادہ سونے اور بہت بیکار رہنے سے خدا کو بغض ہے۔“ (فروع کافی، ج ۵) معصومؑ نے آگاہ فرمایا: ”اپنے کاموں کے انجام دینے میں سستی اور کاہلی سے کام نہ لو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں دنیا اور آخرت دونوں جگہ خوش حالی اور خوش قسمتی سے محروم رکھتی ہیں۔“ (کافی، ج ۵)

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اعلان کیا: ”جس شخص کو اپنے لئے مال جمع کرنے کا شوق نہ ہو کہ اس کے ذریعہ اپنی آبرو کی حفاظت کرے اپنے قرض خواہوں کے مطالبات پورے کرے، اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے، وہ ہر خیر و خوبی سے محروم ہے۔“ (فروع کافی، ج ۵)

خود را بنمایان اسلام میدان عمل میں

تمام انبیاء و اولیاء محنت و مشقت کر کے زندگی بسر

کرتے تھے۔ جناب آدمؑ و لوطؑ کھیتی باڑی کرتے، جناب ابراہیمؑ گو سفندیں پالتے اور انھیں چراتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے جناب شعیبؑ کے پاس رہ کر کئی سال تک ان کی مزدوری کی۔ حضرت ادریسؑ درزی، حضرت نوحؑ بڑھئی، جناب ہودؑ ایک بیوپاری تھے۔ (دستورات زندگی) امام جعفر صادقؑ نے ابی قبرہ سے فرمایا: ”امیر المؤمنینؑ پھڑوہ چلاتے اور زمین کھودتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کھجور کی گٹھلیاں خود زمین میں بویا کرتے تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے ایک ہزار غلام خود محنت مزدوری کر کے راہِ خدا میں آزاد کئے۔“ (فروع کافی، ج ۳)

ایک شخص امیر المؤمنینؑ کے حضور میں شرفیاب ہوا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت کھجور کی گٹھلیوں کے ایک بڑے سے گٹھر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے جس پر آپ تشریف فرما ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر خدا نے چاہا تو ایک لاکھ خرے کے پھلدار درخت ہیں۔ اس کے بعد حضرت نے وہ سب گٹھلیاں ایک ایک کر کے زمین میں بودیں، اُن میں سے ایک گٹھلی بھی نہیں چھوڑی۔“ (فروع کافی، ج ۵)

اہلبیتؑ رسولؐ سے منحرف ایک شخص نے دیکھا کہ تڑاقے کی گرمی کے دن میں حضرت امام محمد باقرؑ اپنے دو غلاموں کے دوش پر ہاتھ رکھے کہیں جارہے ہیں۔ ایک شخص نے حضرت سے کہا کہ تم بوڑھے ہو چکے اور

وہ تھے غلام کاظم

بنت زہرا نقوی ندی الہندی، لکھنؤ

پایا خوش بختی سے نامِ کاظمؑ
ہاں مگر تھے وہ غلامِ کاظمؑ

علمِ باقر پہ عمل کر کے گئے
ایسے اپنایا نظامِ کاظم

فقہ صادق پہ بہت کام کئے
شاد بیحد ہیں امام کاظمؑ

بگڑے حالات پہ ہنستے رہنا
غصہ پی جانا بنام کاظمؑ

خاص و عام آج یہی کہتے ہیں
تھے بہت خاص وہ عام کاظمؑ

ہر محمدؐ کے علیؑ کے بندے
تھے وہ ، کیونکہ تھے غلام کاظمؑ

ماہر علم کلام ہوتے نہ کیوں
کام میں لائے کلام کاظم

علم و تقویٰ سے سکون ملتا ہے
ہے ندی اتنا پیام کاظم



قبیلہ قریش کے شرفاء میں سے ہو۔ تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کہ تم اس وقت طلبِ دنیا کے لئے اپنے گھر سے باہر نکل آؤ۔ اگر اسی حالت میں تمہیں موت آجائے تو کیا کرو گے؟ حضرت نے فرمایا کہ اگر اسی حالت میں مجھے موت آجائے تو وہ ایسے وقت آئے گی جب کہ میں خدا کی اطاعت میں مشغول ہوں اور اس لئے محنت کر رہا ہوں کہ میں خود اور میرے بال بچے تم سے اور دوسرے لوگوں سے سوال نہ کریں۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ مجھے موت ایسے موقع پر آئے جب میں خدا کی نافرمانی کر رہا ہوں۔

یہ سن کر اس شخص نے کہا کہ میں نے تمہیں نصیحت کرنا چاہی تھی، لیکن تم نے اُلٹی مجھے نصیحت کر دی۔ ابو عمر و ناقل ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ ایک پرانا کپڑا پہنے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں پھڑوا ہے جسے وہ اپنے باغ میں چلا رہے ہیں، پسینہ اُن کے جسم سے نکل رہا ہے۔ میں نے کہا کہ حضور میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ یہ پھڑوا مجھے عنایت فرما دیجئے میں یہ خدمت انجام دے دوں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں کہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں انسان اپنی روزی کمانے کے لئے محنت و مشقت کرے۔“

(دستورات زندگی)

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۷ پر۔۔۔۔۔)

عرب کے اقتصادیات اور اسلام کے خدمات

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

اسلام کے آنے سے پہلے عربوں کی اکثریت پر انتشار و پراگندگی کا سایہ تھا۔ ان کے پاس کوئی مستقل جائے سکونت نہ تھی۔ چشموں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں ان کی قیام گاہیں بدلتی رہتی تھیں۔ بالکل آخر میں انھوں نے کعبہ کے گرد مکہ میں قیام کر لیا تھا۔ کعبہ کو شروع سے روحانی مرکزیت حاصل تھی۔ قبائل عرب اطراف و جوانب سے اس کے حج کے واسطے آتے، وہاں قربانیاں کرتے اور خیر خیرات دیتے تھے۔ کثرت سفر کی وجہ سے ان قبائل کے درمیان باہم معاملت ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس میں ترقی ہوئی۔ مناسک حج سے فراغت کے بعد حد و دہر کے باہر خیمہ نصب کر کے انھوں نے بازار لگائے اور خرید و فروخت شروع کر دی۔

اس وقت جزیرہ عرب کے شمال میں فارس اور جنوب میں حبش کا اقتدار تھا۔ ان کے ذہن میں تجارتی تبادلہ کا خیال پیدا ہوا۔ سمندری راستہ قابل اطمینان نہ تھا۔ وہ تجارتی سامان بلاد عرب میں کسی ایک مقام پر لا کر ذخیرہ کر دیتے اور اس کی تھوڑی مقدار اپنے ہمراہ لے کر عرب کے بڑے شہروں کا دورہ کرتے تھے۔ وہاں اپنا سامان نکال کر واپسی میں ان اطراف کا مال اپنے ساتھ لے

جاتے تھے۔ ادھر یمنی عربوں کا کاروبار مشرقی افریقہ اور حبشہ کے غلاموں کی خرید و فروخت تھا۔ ان کے خریدار بیشتر بڑے سوداگر اور زراعت پیشہ افراد تھے۔ یہ غلام بار برداری اور کھیتی باڑی میں کام آتے تھے۔ ان کے مالکوں نے اپنا سارا کام ان پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بنا پر عرب کی اقتصادی حالت میں غلام سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ غلاموں پر اعتماد کلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خوش حال اور فارغ البال مالکوں کا پورا وقت عیش و عشرت، لہو و لعب اور شعر و شاعری کے لئے خالی ہو گیا۔ تجارت و زراعت کے علاوہ نہ انھیں کوئی دست کاری آئی اور نہ وہ علوم و فنون کی طرف توجہ کر سکے۔ ان کے یہاں طبابت کا دار و مدار بوڑھے کاہنوں اور منجموں پر تھا۔ انساب عرب کے واقف کار اور آثار قدیم کے قیافہ شناس ان کے یہاں طبقہ علماء میں محبوب تھے۔ ان کی تجارت غیر منظم اور کاروبار بے ترتیب تھا وہ طبعاً اُباہی اور لہو واقع ہوئے تھے۔ ان کے پڑوس میں روم و فارس کی متمدن قومیں موجود تھیں لیکن وہ ان کے نظم و ضبط کی نقل تک نہ اتار سکے۔ بڑی مدت کے بعد عربوں کو خیال آیا کہ ہمیں بھی اپنے گھر سے نکل کر باہر تجارت کے لئے جانا

چاہئے۔ انھوں نے سال میں دو سفر شروع کئے۔ ایک جاڑے میں یمن کی طرف اور دوسرا گرمی میں شام کی طرف۔ ان سفروں میں حجازی قافلے اپنے ملک کی خاص چیزیں شام و یمن لے جاتے اور واپسی میں وہاں کا سامان لاکر حجاز میں فروخت کرتے تھے۔ یہ قافلے شام و یمن سے دوسرے سامان کے ساتھ سبزیوں اور پھلوں کے بیج بھی لائے۔ ان کی کاشت کے لئے ان کے پاس طائف سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ اس لئے طائف کو زراعت کے لحاظ سے تمام ملک میں نمایاں درجہ مل گیا۔ معاشی اطمینان کے سبب وہاں کی آبادی بھی نسبتاً بڑھ گئی۔ جزیرہ عرب کی خوشحالی اور فارغ البالی میں بیشتر حصہ اسی طائف کی زراعت کا ہے۔ دولت کی فراوانی ہمیشہ عیاشی و فضول خرچی کا سبب بنا کی ہے۔ وہ حجازی عرب جو چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں میں رہنے کے عادی تھے اب ان کے عالی شان بلند و بالا محل بن گئے۔ وہ جن کے گھر کا کام کاج ان کی عورتیں کیا کرتی تھیں اب ان کے یہاں کثرت سے غلام و کنیز نظر آنے لگے۔

غلط فہمی نہ ہو اس ثروت مندی میں ملک کے تمام باشندے شریک نہ تھے۔ زراعت پیشہ عربوں کا ایک محدود طبقہ تھا۔ دوسرے قبائل ان ہی کے پہلو میں ہوا کے رحم و کرم پر کھلے بیابانوں میں خیمے لگائے زندگی بسر کر رہے تھے۔ کبھی تیز ہواؤں کے جھکڑ ان کے خیموں کو اکھاڑ کر انھیں صحرا میں منتشر کر دیتے تھے۔ ان کا کام

اونٹ چرانا تھا۔ ان کی گزر بسر اونٹنیوں کے دودھ پر تھی۔ ان کا پیشہ آس پاس کے دیہاتوں پر ڈاکہ ڈالنا اور آتے جاتے قافلوں کا لوٹنا تھا۔ حجاز میں کوئی حکومت نہ تھی جو ان رہزنوں اور غارت گروں کی سرکوبی کرتی۔

عربوں کی شہری آبادی چار طبقوں پر مشتمل تھی۔ کچھ لوگ شہر میں بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک تھے۔ کچھ لوگوں کی شہر سے باہر زمینیں تھیں جہاں وہ کاشت کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا سوداگری مشغلہ تھا۔ ان کے علاوہ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک بڑی تعداد غلاموں کی تھی۔ یہ متمدن ممالک سے اسیر کر کے لائے گئے تھے۔ وہاں کی بود و باش نے ان کو پورے طور پر مہذب بنا دیا تھا۔ یہ تجارت و زراعت کا کامل سلیقہ رکھتے تھے۔ عربوں کے مختلف اقتصادی شعبوں میں انھوں نے عظیم خدمات انجام دیئے۔ غلاموں کے ذریعہ ان کی تجارت و زراعت میں فی الجملہ نظم و ضبط پیدا ہوا۔ انھوں نے بعض معمولی کاموں میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی۔ غلہ پیسنے کی چکی بہت عمدہ بناتے تھے۔ یہ تمام کام ان ہی کے غلاموں کے ذمے تھے۔ عرب کی فطرت میں بے فکری اور آزادی تھی۔ صحرا نوردی نے ان کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ وہ پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بہت دشوار تھا کہ وہ کسی جگہ بیٹھ کر کوئی کام کریں ان کے ملک کا بیشتر حصہ خشک چٹیل بیابانوں پر مشتمل تھا۔ ان کے پاس نہ سونے

چاندی کے معدن تھے نہ تانبے، لوہے، پیتل، اور کوئلے کی کانیں تھیں۔ ایسی صورت میں وہ زراعت اور باہر کا مال لا کر بیچنے کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حجاز، یمن اور طائف کے لوگوں نے انفرادی طور پر سہی اقتصادی مسائل کی طرف ضرورتوجہ کی۔ انھوں نے شخصی مصالح کے پیش نظر اپنی ثروت میں اضافہ کیا۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک طبقہ کی کشادہ حالی سے پوری قوم کو اطمینان نہیں نصیب ہو سکتا۔ عربوں کے پاس کوئی ایسا اجتماعی نظام نہ تھا جس کی پابندی ساری قوم کو متحمل اور مطمئن بنا سکے۔ ان کے یہاں مختلف قبائل کے مختلف وسائل معاش تھے۔ قریش کی گزر بسر کا دار و مدار چار چیزوں پر تھا۔ خانہ کعبہ کی نگہبانی، حاجیوں کی خدمت گزاری، مویشیوں کی چرائی اور باہر سے آئے ہوئے مال کی خرید و فروخت۔ کھلی ہوئی ہے کہ ان ذرائع سے کوئی منضبط آمدنی نہیں ہو سکتی۔ حالات کے لحاظ سے ان میں برابر کی بیتی ہوتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود انھیں مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے فضول خرچی کرتے تھے۔ اسراف و تبذیر کا نام انھوں نے حوصلہ مندی اور دریادلی رکھ لیا تھا۔ نتیجتاً انھیں کبھی شدید تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت ان کو غذا میں جو کھجور اور بھیڑ بکری کے دودھ کے سوا اور کچھ میسر نہ ہوتا۔ ان کی سکونت شہر میں چھوٹے چھوٹے گھروں میں اور بیابانوں میں خیموں کے اندر تھی، علمی و صنعتی شعبوں سے

اجنبیت کی بنا پر انھیں اپنی سطح زندگی کو بلند کرنے کا تصور تک نہ ہوا تھا، اس کا ایک ناخوشگوار تجربہ اس وقت ہوا جب قریش نے خانہ کعبہ کی مرمت و درستی کرنا چاہی۔ عبرت کی بات ہے کہ اس موقع پر پورے ملک میں ایک معمولی بڑھئی دستیاب نہ ہو سکا بلکہ مصر سے بلانا پڑا۔ تاہم خانہ کعبہ کی وجہ سے حجاز کی طرف ہر شخص کا دل کھینچتا تھا۔ اس کی خدمت گاری اور مجاوری کے سبب قریش پر عزت و احترام کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ ان کا آوازہ شہرت دور دور تک پہنچ گیا تھا موسم حج میں ان کو خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ بادشاہ یمن کے دل میں قریش کی یہ مرکزیت خار بن کر کھلنے لگی۔ اس نے عربوں کی روحانی توجہ کو موڑنے کے لئے خود یمن میں ایک عمارت بنوائی۔ بہترین قیمتی سامان سے اس کی آرائش کی اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ فتح و ظفر بظاہر یقینی تھی لیکن انسانی ارادہ خدائی ارادہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ خانہ کعبہ اپنی جگہ باقی رہا بلکہ اس واقعہ نے اس کی بابت عربوں کی عقیدت کو اور بڑھا دیا۔ قریش کی آمدنی بڑھنے کے ساتھ ان کا درجہ اونچا ہو گیا۔ اجتماعی مصالح کو نظر میں رکھتے ہوئے قریش نے بھی عربوں کے لئے کسی نظام اقتصادی کی تشکیل نہیں کی۔

جہالت و بربریت سے ہر قوم کے اخلاقیات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ عیاشی، سیہ کاری اور شراب نوشی عربوں کا عام مشغلہ تھا۔ اس کی علت رومی کنیزوں اور

شامی شراب کہنے کی درآمد تھی۔ عرب پرانی شراب کے قدیم شیفٹہ و دلدادہ تھے۔ روز کا مشاہدہ ہے کہ پڑی ہوئی عادتیں مشکل سے چھوٹی ہیں۔ عادت انسان کو ایسے اقدامات پر مجبور کر دیتی ہے جو خود داری کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ وہ مغرب و عرب جسے سرکلٹنا گوارہ لیکن کسی کے سامنے گردن جھکنا ناگوار تھا اس کا دست سوال عادت کی پیاس بجھانے کے لئے غیر کے سامنے پھیلا ہوا تھا قرض کی عمومی لین دین سود خواری تک منتہی ہوا کرتی ہے۔ اس کے نتائج غیر مبہم ہیں۔ ہر شخص انھیں محسوس کر سکتا ہے۔ عرب فقیر ہو گئے۔ ان کا معیار زندگی پست تر ہو گیا۔ ان کی دولتیں ایک خاص طبقہ کے ہاتھ میں پہنچ گئیں۔ لطف یہ کہ وہ عرب نہ تھے۔ اجنبی تھے جو ان کے ملک میں رہنے لگے تھے۔ جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو اس کے احساس کی قوتیں سو جاتی ہیں عرب خواب غفلت میں تھے۔ انھیں واقعہ فیل اور لشکر ابرہہ کی گہما گہمی بھی بیدار نہ کر سکی۔ ان میں بات بات پر تلواریں کھینچی تھیں ان کے دلوں میں بغض و حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اوس و خزرج کی لڑائیاں اور حرب فجار کی مشہور خونریزیاں ابرہہ کے مکہ پر حملہ کے بعد ہوئی ہیں۔ اس انتشار و خلفشار کے ہوتے کس کو توقع تھی کہ عرب قوم کسی سیاسی و اقتصادی نظام عام کے سایہ میں ایک حاکم کے زیر اقتدار جمع ہو جائے گی۔ پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت عربوں کی حالت بہت نازک تھی۔ طائف، مدینہ

اور یمن کے بعض خطوں کے سوا پورا ملک اکثر قحط سالی کا شکار رہتا تھا۔ ساری قوم پر اجتماعی و اقتصادی بد نظمی چھائی ہوئی تھی۔ پورے ملک کی پونجی سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ عربوں کی حالت اور ان کی ذہنیت کا اندازہ ان مطالبات سے بخوبی ہو جاتا ہے جو رسول اکرمؐ کے سامنے پیش کئے گئے۔ خواہش کی گئی کہ مکہ اور اس کے گرد سے پہاڑ ہٹ جائیں، وہاں باغ لگیں اور نہریں جاری ہوں، کوہ صفا اور کوہ مروہ سونے چاندی کے ہو جائیں، زمین سے زرو جو اہر کے خزانے نکل آئیں۔ ان فرمائشوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں شدید فقر و تنگ دستی کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ سستی اور کاہلی اور بے عملی ان کے خمیر میں مل گئی تھی۔ مال دنیا کا لالچ ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو گیا تھا۔ وہ محنت مشقت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ماحول تھا کہ ۱۱۰ء میں رسول اسلام کی بعثت ہوئی۔ آپ نے عظیم اجتماعی معجزہ پیش کیا۔ ناقابل ترمیم قوانین شریعت بنائے۔ فطری اور مضبوط نظام اقتصادی کی داغ بیل ڈالی۔ آپ نے حکیمانہ تعلیمات و ہدایات کے ذریعہ بیمار فطرتوں کی مسیحا کی۔ وحشی و غیر مہذب دماغوں کی تربیت کر کے انھیں تازہ اجتماعی و اقتصادی انقلاب کو قبول کرنے کے لائق بنایا۔ مکہ کے دوران قیام میں تیرہ برس تک رسولؐ اور آپ کے ہمراہیوں کی زندگی غیر مطمئن تھی۔ مشرکین کی طرف سے مزاحمتیں پورے شباب پر تھیں۔ وہاں اس تازہ

انقلابی نظام کو بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا مکمل نفاذ مدینہ آنے کے بعد ہوا۔ ہجرت کے بعد آنحضرتؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان برادری قائم کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ کمال ایمان یہ ہے کہ ایک برادر مومن کے لئے وہی چاہے جو اپنے واسطے چاہتا ہے۔ اسلام میں اقتصادیات کی بنیاد اخوت، محبت اور تعاون باہمی پر ہے۔ وہ خود غرضی، بد معاملگی اور حسد سے نفرت کرتا ہے۔ اسلام نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ انصار نے اپنے املاک و اموال کا نصف حصہ مہاجرین کو دے دیا۔ ایثار و اخوت کا یہ مظاہرہ تربیت اسلامی کا معجزہ تھا۔ رسولؐ نے عربوں کو تجارت کی طرف خاص طور سے متوجہ کیا۔ عرب ایک خشک صحراوی ملک ہے۔ تجارت کے سوا وہاں خوش حالی بڑھانے کا کوئی دوسرا وسیلہ نہ تھا۔ حضرتؐ نے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

تسعة اعشار الرزق في التجارة۔ رزق کے دس حصوں میں سے نو تجارت میں ہیں۔ اسلامی شریعت نے معاملات میں حلال و حرام کی تفریق کی۔ مسلمانوں کے درمیان سود کی لین دین کو ناجائز قرار دے دیا۔ سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کی حرمت نے اقتصادی توازن قائم کیا۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک طبقہ کے ہاتھ میں سمٹ کر پہنچ جائے۔ اس نے رہزنوں اور غارت گروں کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔ اس سے جزیرہ

عرب میں تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کے لئے کوئی خطرہ نہ رہا۔ ہم نے پہلے بتایا کہ اسلام سے قبل عربوں کے پاس چوروں اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے واسطے کوئی منظم طاقت نہ تھی۔ ان کے تجارتی قافلے اکثر و بیشتر راہ میں لٹ جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے عربوں کی اقتصادی حالت بن بن کر بگڑ جاتی تھی۔ نرخ اور کیل و وزن کا ان کے یہاں کوئی معیار نہ تھا۔ اس کا دار و مدار ان کی مرضی پر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے درمیان خرید و فروخت کم ہو گئی اور ان میں کساد بازاری پھیل گئی۔ قرآن مجید نے صاف اعلان کیا:

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْبِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ۔ (سورہ اعراف آیت ۸۵)

”ناپ تول میں دیانت داری سے کام لو اور لوگوں کی حق تلفی نہ کرو۔“

وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْبِيزَانَ۔ (سورہ رحمن آیت ۹)

”ہمیشہ ایمان داری سے وزن کرو، کم نہ تولو“

ان ہدایات نے عربوں کے بازاروں کو منظم اور لوگوں کو معاملت پر آمادہ کیا۔ قرآن مجید نے فضول خرچی کو ممنوع قرار دے کر ان کے اخراجات کو محدود بنا دیا۔ اس نے بخل اور اسراف کی مذمت کی اور میانہ روی کی تعریف فرمائی۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا

وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا۔ (سورہ فرقان آیت ۶۷)

وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی اور کنجوسی نہیں کرتے بلکہ میانہ روی برتتے ہیں۔ قرآن فضول خرچ لوگوں کو شیطان کا بھائی سمجھتا ہے۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ۔ اس کے قبل عرب ہمیشہ خالی ہاتھ رہتا تھا اب اس کی جیب میں پیسے رہنے لگے۔ اسلام کا رسول امی اقتصادیات کے اصول سے باخبر تھا۔ پیغمبرؐ خوب جانتے تھے کہ منجمد دولت کھٹی رہے گی اس کے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انھوں نے سونے چاندی کے سکوں میں وجوب زکوٰۃ کی شرط قرار دی کہ وہ سال بھر ایک حالت میں نہ رکھے رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ دولت کا تبادلہ تجارت، زراعت اور دوسرے کاموں میں برابر ہوتا رہے۔ خمس و زکوٰۃ کی نوعیت اس ٹیکس کی ہے جو حکومتوں کی طرف سے اس وقت عائد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے کاروبار کی نگرانی کرنا پڑی۔ ان کے معاملات و حسابات منضبط ہو گئے۔ وہ عظیم مالی نقصانات سے بچ گئے۔ جزیرہ عرب کی وحدت اور اسلام کے واحد نظام اقتصادی کی پابندی نے عربوں کے درمیان معاملات کی تعداد بڑھادی۔ اس کے پہلے بہت سے بلند صلاحیتوں کے افراد پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے۔ سود کی زیادتی قرض لینے سے مانع تھی۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دے

کر انھیں کام کرنے کا موقع دے دیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو قرض دینے کی جانب رغبت دلائی: مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۴۵) کون ہے جو خدا کو بے سود و ربا قرض دے تاکہ وہ اس کا عوض بہت بڑھا چڑھا کر عطا کرے تنگی و کشادگی دینا خدا کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔

معاملت کا ہمیشہ نقد ہونا بہت مشکل ہے۔ اکثر انسان کے پاس پیشہ نہیں ہوتا لیکن ضرورت معاملت پر مجبور کرتی ہے۔ اس صورت میں آدمی باہم سمجھوتہ کر کے ایک مدت مقرر کرتا ہے کہ قیمت یا مال اس وقت دیا جائے گا۔ اسلام کے پہلے عرب کی قرض کی ادائیگی کے لئے صرف زبانی عہد و پیمان کر لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مالی معاملات میں فقط زبانی قرارداد سے تحفظ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ قرض دار بعد کو انکار کر دے یا وہ مرجائے اور اس کے ورثا مکر جائیں۔ ان برے نتائج کا لحاظ کر کے اسلام نے ایک مضبوط و قابل اطمینان قانون نافذ کیا۔ تاریخ اسلام سے پہلے اس کا وجود نہیں بتلاتی ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ
فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا
شَهِيدَيْنِ مِّن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ
وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْأَمُوا أَن
تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَلِكُمْ
أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا
تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا
(سورہ بقرہ آیت: ۲۸۲)

”اے ایمان والو! اگر تم ایک مدت معین تک قرض
لو تو تمہیں ایک دستاویز لکھ دینا چاہئے اس کی تکمیل کوئی
شخص انصاف اور دیانت داری سے کر دے۔ کاتب
اس کے لکھنے سے انکار نہ کرے۔ قرض دار کو قرضہ کا
اقرار کرنا اور خدا سے ڈرنا چاہئے اس کے واسطے یہ
درست نہیں ہے کہ وہ اقرار میں قرضہ کی مقدار کم
کر دے۔ اب اگر قرض دار احمق یا کمسن ہو یا کسی وجہ
سے اقرار پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا
ولی اقرار کر لے گا اس کے علاوہ دو مردوں کو گواہ بھی
بنادو، دیکھو قرض کی رقم کم ہو یا زیادہ تمہیں دستاویز لکھنے

میں کبیدگی نہ محسوس کرنا چاہئے گواہی کی بنا پر یہ معاملت
درست اور مستحکم تر ہو جائے گی۔ اس کے بعد کسی شک
وشبہہ کی گنجائش نہیں باقی رہ جائے گی۔ ہاں اگر
خرید و فروخت دست بدست نقد ہو تو پھر لکھنے پڑھنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے اس حکم سے
اقتصادیات کو بڑا فائدہ پہنچا۔ یہ دستاویز قرض دار کے
ذمہ قرضہ کا بہترین ثبوت بن گئی۔ اس کے ذریعہ میعاد
کے اندر قرض خواہ اپنے مطالبہ کو وصول کر سکتا ہے۔ قرض
دار اگر فوت ہو جائے تو دستاویز دکھا کر اس کے ورثا سے
قرضہ کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس دستاویز کے ذریعہ
قرض خواہ کے لئے بہت سے منافع حاصل کرنے کا
امکان ہے وہ اس کو پیش کر کے دوسروں سے قرض
معاملت کر سکتا ہے۔ تمام معاملات اور مالی مبادلات کی
بنیاد اس وقت ان ہی دستاویزوں پر ہے۔

اسلام نے عربی ماحول کے بالکل خلاف غلاموں
کے لئے مختلف سہولتیں پیدا کیں ان کی آزادی کے لئے
راہیں نکالیں۔ متعدد گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار
دیا۔ اس وجہ سے غلاموں کی ایک جماعت آزاد ہو گئی
جس کی تعداد برابر بڑھتی گئی یہ تجارت و زراعت میں ماہر
تھے۔ لہذا آزادی کے بعد اسی میں مشغول ہو گئے۔
غلاموں کے بارے میں رسولؐ نے وہی طریقہ کار اختیار
کیا جو یہودیوں کے بارے میں اطراف خیبر میں یہودی
کھیتی کرتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد پیغمبرؐ نے ان کو بے

دخل نہیں کیا۔ ان سے معاہدہ کر لیا کہ یہاں کی پیداوار کا نصف حصہ تمہارا اور نصف مسلمانوں کا ہوا کرے گا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ علاقہ خیبر کھیتوں اور باغوں سے لہلہا رہا تھا۔ اس کو فنون زراعت کے ماہرین کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں ان فنون کے واقف کار افراد کم تھے۔ اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ ایک معاہدہ کر کے اس خطہ کو یہودیوں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ ہم نے پہلے بتایا کہ غلاموں کو تجارت و زراعت کی بابت خاص مہارت حاصل تھی۔ اس لئے سارے ملک کی تجارت و زراعت ان ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسلام سرے سے غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دے دے۔ اس سے ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہو جاتی۔ آزادی کے بعد یہ غلام انتقاماً یا کام کرنے سے انکار کر دیتے اور یا اپنے اپنے وطنوں کو واپس چلے جاتے۔ اسلام نے ملک کو اقتصادی تباہی سے بچانے کی خاطر غلامی کو تدریجاً ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اگر اسلام اس بارے میں کوئی انتہائی قدم اٹھا دیتا تو بعید نہ تھا کہ مسلمان رسولؐ کی زندگی ہی میں خانہ جنگی اور باہمی کش مکش کا شکار ہو جاتے۔

تاریخ سے باخبر افراد جانتے ہیں کہ انیسویں صدی میں جب شمالی امریکہ میں غلامی کو یکسر ختم کرنے کا اقدام کیا گیا تو کیسی خطرناک رسہ کشی اور تباہ کن ریزی ہوئی۔ ملک کے جنوبی باشندوں نے شدید مخالفت کی اور

بالآخر دونوں فریقوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ اس کش مکش کا سبب صرف یہ تھا کہ سارے ملک کی زراعت کا دار و مدار غلاموں کے اوپر تھا بے شک اس جنگ میں شمال والے کامیاب ہوئے اور انھوں نے غلاموں کو آزاد کرالیا لیکن اس آزادی کی قیمت میں انھیں لاکھوں آدمیوں کا خون دینا پڑا۔ رسولؐ اگر اس طرح کا اقدام کرتے تو غلام خواہ مخواہ آزاد ہوتے یا نہ ہوتے اقتصادی بربادی کے ساتھ اسلام کا نام و نشان صفحہ عالم سے بالکل مٹ جاتا۔ امریکہ میں غلامی ختم کرنے کے سوال پر خوں ریزیاں ہوئیں مگر اس کے ختم ہونے کے بعد ملک کو تباہ کن اقتصادی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی میں دنیا صنعت و حرفت میں کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ تجارت و زراعت کے کاموں سے غلاموں کے علاوہ ملک کے دوسرے طبقے واقف ہو چکے تھے۔ اسلام کا سابقہ ساتویں صدی کے جاہل کابل اور ناواقف عربوں سے تھا۔ اس وقت غلامی کو دفعۃً ممنوع قرار دینے کے معنی ملک کی اقتصادی موت اور اسلام کی تباہی ہوتے، بے عملی اور کاہلی عربوں کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ انھیں محنت و مشقت کر کے پیٹ بھرنا بہت کھلتا تھا۔ وہ دوسروں سے کام لینے کے عادی تھے۔ ان کے نزدیک خود کام کرنا ذلت کا باعث تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس ذہنیت کو اپنے ذاتی عمل سے بدلنا چاہا۔ ایک مرتبہ حضرت معہ چند اصحاب کے کسی سفر میں

تشریف لے جا رہے تھے آپ نے ایک بکری کا سالن پکانے کا حکم دیا۔ اصحاب نے یہ سن کر فوراً باہم تقسیم عمل کر لی۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس کو ذبح کروں گا، دوسرے نے کہا میں اس کے صاف کرنے کا ذمہ دار ہوں، تیسرے نے کہا اس کا پکانا میرے ذمہ ہے۔ یہ سنکر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اور پکنے کے لئے لکڑیاں میں جمع کروں گا۔ اصحاب نے عرض کیا کہ حضور اس خدمت کو آپ کی طرف سے ہم انجام دے لیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تم لوگ کام کرو اور میں الگ بیٹھا رہوں: ان اللہ یکرمہ من عبدہ ان یراہ متمیزا بین اصحابہ۔

اسلام نے محنت مزدوری کو اتنی اہمیت دی کہ عبادت الہی پر اس کو مقدم کر دیا۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان امور معاش کو چھوڑ کر ہمیشہ محراب عبادت میں نظر آئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بزم میں کسی شخص کا ذکر خیر ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ ایک سفر میں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ سوار ہو کر برابر ذکر الہی کرتا رہتا تھا اور اتر کر نمازوں میں مشغول ہو جاتا۔ اس کا کوئی وقت عبادت سے خالی نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا: کہ پھر اس کے اونٹ کو چارہ کون دیتا تھا۔ اس کا کھانا پینا کس کے ذمہ تھا؟ لوگوں نے کہا کہ اس کی دیکھ بھال ہم سب کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم سب اس سے بہتر ہو۔ کسب معاش کی طرف اس سے

بڑھ کر توجہ دہانی کیا ہوگی کہ پیغمبرؐ نے سب کو خدا کا دوست اور بے عمل کو اس کا دشمن بتلایا۔ آپ نے فرمایا کہ: لان یاخذ احدکم جلسہ ثم یعدوا الی الجبل فیحطب فیبیع خیرلہ من ان یسئل الناس۔ ”دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر ہے کہ انسان پہاڑ پر سے لکڑی ڈھوئے اور اس کو فروخت کرے۔ ان ہدایات سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام سخت مزدوری کا حامی ہے۔ اس نے عربوں کی ذہنیت میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔ اس کی بیکاری بے عملی، راحت طلبی اور تعیش پسندی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کی کوشش کی۔ انھوں نے عزت و ذلت کے جو تخیلات قائم کر لئے تھے انھیں غلط بتلایا۔ ان کے واسطے آزادانہ تجارت کے راستوں کو کھول دیا۔ ان کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت کو محفوظ بنادیا۔ ان کے درمیان قرض کی لین دین کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ سود خواری کو ناجائز قرار دے کر ان میں اقتصادی توازن قائم کیا۔ ان کے اموال میں فریضہ زکوٰۃ عائد کر کے ان کی کاروباری زندگی کو منضبط کرایا۔ خمس و زکوٰۃ کے توسط سے ان میں خوش حالی پھیلائی اور فقر و فاقہ سے انھیں نجات دلائی۔ کیا عرب کے اقتصادیات میں اسلام کے ان زریں خدمات کو تاریخ فراموش کر سکتی ہے؟



دنیا..... دین کی نظر میں

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

عام رجحان اور اس کا پس منظر

عام طور سے لوگوں کے دماغ میں یہ خیال راسخ ہے کہ دنیا بری ہے۔ وہ دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ جو شخص بھی وعظ کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہی آتا ہے کہ وہ لوگوں کے دل کو دنیا کی طرف سے موڑے اس کی نظر میں اسے حقیر اور ذلیل کرنے کی کوشش کرے۔ اس مسئلہ کا لوگوں کی اخلاقی تربیت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بغیر اسے حل کئے ہوئے اس سوال کا جواب نہیں مل سکتا کہ وہ مسائل زندگی کی طرف کس طرح اور کیونکر متوجہ ہوں؟ اس لحاظ سے اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اسے صحیح طریقہ سے سلجھا دیا جائے تو اس کا بہت اچھا اثر لوگوں کے اخلاقیات اور ان کے باہمی روابط و تعلقات پر پڑے گا۔ اس سلسلے میں غلط فہمیاں انسان کے اعصاب کو سن کر سکتی اور اس کے دل و دماغ کو بے حس بنا سکتی ہیں۔

طرح طرح کی شخصی اور اجتماعی بد بختیوں کا سرچشمہ بن سکتی ہیں۔ اسے قضا و قدر کی کار فرمائی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے متعلق نظم اور نثر میں نصیحتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے اس میں یہی کوشش کی گئی ہے

کہ انسان کے اعصاب سن اور بے حس ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ۱۔ دنیا میں اسلام کے آنے سے پہلے جو فلسفے رائج تھے ان کی بنیاد اسی پر تھی کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ برا ہی برا ہے۔ ان فلسفوں کی عمارت زمانے، دنیا اور خود وجود سے بدظنی کی اساس پر بلند ہوئی تھی۔ دوسری قوموں سے ملنے جلنے کی وجہ سے یہ فلسفے مسلمانوں کے درمیان بھی پھیل گئے۔

۲۔ ظاہر ہے کہ چودہ سو برس کے طویل عرصہ میں مسلمانوں کو بڑے بڑے کٹھن اور ناخوشگوار واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ انقلاب کے طاقتور ہاتھوں نے انہیں زیروزبر کر دیا۔ ان کے عروج کو زوال سے بدل دیا۔ سکون اور اطمینان کی نعمت ان سے چھین لی۔ عزت و اقتدار کا تاج ان کے سر سے اتار لیا۔ ان کی قدرتی دولت کے خزانے لوٹ لئے یا انہیں ہتھیا لیا۔ انہیں غریبی، افلاس، بے چارگی اور محتاجی کی مصیبتوں نے ہر طرف سے گھیر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان دنیا سے بدظن ہو جائیں۔ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ اسے حقیر اور ذلیل سمجھنے لگیں۔

قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے؟

دنیا کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا قرآن مجید بھی انسان کو دنیا سے بدظن بنانا چاہتا ہے؟ جہاں تک اسلام اور قرآن کا تعلق ہے وہ انسان کو اس قسم کی تعلیم نہیں دیتا ہے۔ بے شک قرآن کریم نے دنیا کی زندگی کو فانی اور ناپائیدار قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک وہ اس قابل نہیں ہے کہ انسان اسے اپنی انتہائی آرزو اور مقصد اصلی سمجھے۔ قرآن مجید نے اعلان کیا: **الْبَالُ وَالْبُنُونُ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا**۔

(سورہ کہف آیت ۴۶)

”مال اور اولاد اس دنیوی زندگی میں چہل پہل پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ لیکن نیک اعمال جو باقی رہنے والے ہیں وہ اس لئے بہتر ہیں کہ خدا ان کا صلہ عطا فرمائے گا۔ وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ انسان ان کی تمنا کرے۔

شروع سے آخر تک قرآن کی ورق گردانی کر ڈالئے۔ اس نے کہیں اس دنیا کے موجودات آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں، درختوں اور جانوروں کی برائی نہیں کی ہے۔ اس کے برخلاف انھیں اور ان کے نظام کو تعریف کے قابل سمجھا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا عِبْدِينَ۔ (سورہ دخان آیت ۳۸)

”ہم نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں

کو بلا کسی مقصد کے کھیل کے طور پر نہیں پیدا کیا ہے۔“
قرآن مجید میں مختلف موجودات عالم کی قسم کھائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ خدا کی نظر میں برے اور حقیر ہوتے تو وہ ہرگز ان کی قسم نہ کھاتا۔ **وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا**۔ (سورہ شمس آیت ۱-۲)
سورج اور اس کی دھوپ کی قسم چاند کی قسم وہ اس کے پیچھے نکلے۔ **وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَلَلْهَمَّهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا**۔ (سورہ شمس آیت ۸-۷)

”نفس انسانی کی قسم اور اس کی طاقت کی قسم جس نے اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک بنایا۔ اس کے بعد اس کے پیدا کرنے والے نے اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کا شعور بھی رکھ دیا۔“

حقیقت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی چیزوں کو حقیر اور برا سمجھنا فلسفہ اسلام کے مرکزی نقطے معرفت خدا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ یہ نظریہ مادہ پرستی اور انکار خدا سے میل کھاتا ہے۔ اس کا سرچشمہ یگانہ پرستی نہیں۔ ثنویت اور دوگانہ پرستی بھی ہو سکتی ہے۔ بعض مذاہب وجود کے دو سرچشمے قرار دیتے ہیں۔ ایک نیکی کا سرچشمہ اور دوسرا برائی کا سرچشمہ۔ لیکن اسلام کی اساس خدا کے اعتقاد پر ہے۔ وہ ساری کائنات کو اس کی کارسازی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ذرے سے لے کر آفتاب تک اُس کے وجود کی نشانیاں ہیں جو صرف اس کے وجود کو نہیں، اس کے علم، حکمت اور قدرت کو بھی بتا رہی ہیں۔

ٹھیک اور بالکل ٹھیک کہ قرآن مجید میں زوال اور فنا کی مثال کے طور پر دنیا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے اس گھاس کے مانند قرار دیا گیا جو برسات میں خود بخود زمین سے اگتی، بڑھتی پھر کچھ دن کے بعد پیلی اور خشک ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا مقصد انسان کی نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ انسان دنیا اور اس کے مادی امور کو اپنی انتہائی آرزو نہ قرار دے یہ اس قابل نہیں ہے کہ انسان جیسے اشرف المخلوقات موجود کا مقصد اصلی بنے۔ اس بات کا اس سے کیا ربط کہ ہم دنیا کو ذاتاً برا اور حقیر سمجھیں؟

یہی وجہ ہے کہ مفسرین اور علمائے اسلام کے درمیان کوئی شخص ایسا نہیں ملتا کہ جس نے قرآن مجید سے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عالم اور موجودات عالم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھو۔ ہمیشہ ان کی طرف سے بدظن اور بدگمان رہو۔

دنیا نہیں۔ محبت دنیا

دنیا سے متعلق قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور توجیہ کرتے ہوئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ان کا مقصد خود دنیا کی برائی کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا انہی موجود کا نام ہے۔ دنیا، یعنی زمین، آسمان، چاند، سورج، پہاڑ دریا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بری نہیں ہے۔ یہ چیزیں کیسے بری ہو سکتی ہیں جب کہ ان میں سے ہر ایک خدا کی حکمت و قدرت کی نشانی ہے؟ ان کا خیال ہے کہ جو چیز بری اور قابل مذمت ہے وہ ان

موجودات سے محبت اور دوستگی ہے۔ دنیا بد نہیں محبت دنیا بد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ محبت دنیا کی مذمت میں نظم و نشر کا اتنا بڑا ذخیرہ مختلف زبانوں میں موجود ہے جس پر مستقل طور سے کام شاید پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ریسرچ پر موضوع بن سکتا ہے۔ مذمت دنیا کی مذکورہ توجیہ بہت مشہور ہے۔ اکثر لوگوں سے اگر آپ پوچھیں کہ دنیا کے برے ہونے کا کیا مطلب؟ تو وہ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ محبت دنیا بری ہے ورنہ دنیا خود بخود بری نہیں ہے۔ وہ بری ہوتی تو خدا اسے پیدا نہ کرتا۔ وجود میں آنے والی کوئی چیز بری نہیں ہے۔ چونکہ وجود ذاتاً عدم سے اشرف ہے اس لئے کوئی موجود پست اور حقیر نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ بالا توجیہ اگرچہ بہت مشہور ہے۔ وہ انتہائی مسلم اور بے عیب فرض کی گئی ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ عقلی طور پر صحیح ہے اور نہ خود قرآن مجید کے دوسرے آیات کا مضمون اس کے ساتھ سازگار ہے۔ سب سے پہلے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ انسان جو دنیا سے محبت کرتا ہے آیا وہ فطری اور طبعی ہے یا ایسا نہیں ہے؟ مخصوص اسباب مثلاً رسم و رواج وغیرہ نے یہ محبت اس کے دل میں پیدا کر دی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ اپنے بچوں سے اور اولاد اپنے والدین سے محبت کرتی ہے۔ عورت کو مرد سے محبت ہے، مرد عورت کو چاہتا ہے۔ ہر شخص مال و دولت سے تعلق خاطر رکھتا ہے۔ ہر ایک کی آرزو ہے کہ لوگ اس کی

عزت کریں۔ وہ سماج میں محبوب اور ہر دل عزیز ہو۔
فرمائیے کہ یہ مختلف چیزوں سے محبتیں ہر شخص کی
فطرت میں راسخ ہیں یا بناوٹی ہیں؟ غلط تربیت کا نتیجہ
ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ محبتیں فطری ہیں جب کہ ایسا
ہے تو یہ بری اور مذموم کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ کیونکر انسان کا
فرض ہو سکتا ہے، کہ انھیں دور کرے، اپنے دل سے نکال
کر باہر پھینک دے؟

جس طرح ان چیزوں کو جو بیرونی دنیا میں موجود ہیں
بری، قابل مذمت اور خالی از مصلحت نہیں کہا جاسکتا اسی
طرح انسان کے فطری رجحان اور میلان کو بے حکمت و
مصلحت نہیں کہا جاسکتا۔ کوئی سنجیدہ، صاحب فہم ایک
مہین سی رگ ایک ننھے سے جز ایک باریک بال کی
بابت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ انسان یا جانور کے جسم میں
بے فائدہ بے مقصد، لغو اور فضول ہے۔

یہی صورت انسان کے نفسیات اور روحیات کی
ہے۔ انسان کے رجحانات اور میلانات کی فہرست میں
کوئی طبعی اور فطری میلان و رجحان ایسا نہیں ہو سکتا جو
بے حکمت، بے مصلحت، بے فائدہ اور بے مقصد ہو ان
میں سے ہر ایک اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی حکمت اور
مصلحت رکھتا ہے۔ اولاد سے محبت، والدین سے محبت،
بیوی سے محبت، مال و دولت سے محبت، ترقی و اقبال سے
محبت، محبوبیت اور ہر دل عزیزی سے محبت۔ ان میں سے
ہر ایک کی ذات کے ساتھ بڑی بڑی حکمتیں اور مصلحتیں

لپیٹی ہوئی ہیں۔ ان کے بغیر انسانی زندگی کا شیرازہ قائم
نہیں رہ سکتا ہے۔ پھر اسے کیا کیجئے گا کہ خود قرآن مجید ان
محبتوں کو خدا کی حکمت و قدرت کی نشانی قرار دیتا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً
وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُتَفَكَّرُونَ۔

(سورہ روم آیت ۲۱)

”قدرت خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ
اے لوگو! اس نے خود تمہاری جنس سے تمہارے لئے
شریک حیات کو قرار دیا۔ تمہارے دلوں میں ایک
دوسرے کی محبت رکھی۔ اس بات میں خدا کی حکمت،
مصلحت، تدبیر اور تسخیر کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے
لئے جو اس قسم کے مسائل میں غور کرتے ہیں۔ اگر زن
و مرد کی باہمی محبت بری اور قابل نفرت ہوتی تو اسے ہرگز
اس آیت میں خدا کے حکیمانہ کارناموں کی فہرست میں
ذکر نہ کیا جاتا۔

اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رجحانات اور میلانات
نظم عالم کے برقرار رہنے کا ذریعہ ہیں۔ اگر یہ فطری
محبتیں نہ ہوتیں تو نسل انسانی وجود میں نہیں آسکتی تھی،
تمدن کی گاڑی رینگ نہیں سکتی تھی۔ لوگ ہاتھ پر ہاتھ
دھرے بیٹھے رہتے، نہ کارخانے ہوتے، نہ فیکٹریاں
ہوتیں نہ محنت ہوتی نہ مزدوری ہوتی نہ حرکت ہوتی، نہ
ترقی ہوتی ہر طرف جمود و خمود، سکوت و سکون چھایا ہوتا۔

جو طبقہ تمام موجودات عالم سے بدظن ہے۔ ساری کائنات کو برا اور قابل مذمت سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی راہ چارہ تدبیر نہیں ہے۔ اسے بہر حال انہیں سانپ بچھوؤں کے بیچ میں رہنا اور ان کے ساتھ نباہ کرنا ہے۔ دوسروں کو ڈستے رہنا اور خود ان کے ڈنکوں سے چھدتے رہنا ہے۔ ہاں وہ لوگ کہ جو کہتے ہیں کہ دنیا بری نہیں ہے۔ محبت دنیا بری ہے، ان کے لئے سلامتی کا راستہ موجود ہے۔

انہیں ان میلانات سے ٹکر لے کر انہیں مغلوب کر لینا بلکہ اپنی فطرت سے اگر ہو سکے تو ان کی جڑیں اکھاڑ کر دور پھینک دینا چاہئے ایسا کرنے کے بعد ممکن ہے کہ انسان کی جان شر کے پنجے سے چھوٹ جائے وہ خوش بخت اور خوش طالع ہو جائے۔

لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ فلسفہ کا فیصلہ ہے اور علم النفس بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جو میلانات اور رجحانات موجود ہیں ان کی جڑیں روح انسانی کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ انہیں اکھاڑا نہیں جاسکتا۔ انتہائی دھینکا مستی اور کوشش کے بعد انہیں بس ڈھکیل کر شعور باطن کے حدود میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اکثر دوسرے راستوں سے نہایت خطرناک طور پر ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو اعصابی اور نفسیاتی روگوں میں جکڑ دیتے ہیں۔ ان کی زد میں اس کے دل و دماغ

آجاتے ہیں۔ یہ کوئی رقیق، عمیق، باریک اور گہری بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کسی فطری میلان کا گلا گھونٹ دینا انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا یہ ایسا ہی ہے کہ وہ اپنے اعضاء جسم میں سے کسی جز کو ہاتھ یا پیر یا ناک یا کان کو کاٹ ڈالے ہر قوت انسان میں کسی مقصود غرض کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرار دی گئی ہے۔ عالم خلقت میں کوئی چیز بے فائدہ، بے مصلحت اور بے حکمت نہیں ہے۔ کسی طاقت اور اس کے مرکز کو اجاڑ کر انسان چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ موجودات عالم سے محبت بری اور مضر ہے۔ اس میں چارہ و تدبیر کی راہ بھی یہ نہیں بتائی گئی ہے کہ ان فطری میلانات کا سر کچل دینا چاہئے۔

پھر صحیح کیا ہے؟

صحیح وہی ہے جس کی طرف پہلے ایک چھوٹا سا اشارہ کیا گیا ہے۔ صحیح وہی ہے جس کا اعلان اسلام اور قرآن نے کیا کہ دنیا کی مادی چیزوں کو مقصد اعلیٰ قرار دینا غلط ہے۔ انہیں پا کر یہ سمجھ لینا درست نہیں ہے کہ ہم نے سب کچھ پا لیا۔ پھر وہی آیات پڑھئے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کے ساتھ پڑھئے۔ اَلْبَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا۔ (سورہ کہف آیت ۴۶)

مال و دولت اور اولاد اسی دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ لیکن وہ اعمال خیر جو خداوند عالم کے عوض دینے کی وجہ سے

باقی رہنے والے ہیں یقیناً بہتر اور اشرف ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ انسان انھیں اپنا مقصد اعلیٰ قرار دے۔ اسلام اور قرآن اہل دنیا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِيَتِنَا
غَافِلُونَ (سورہ یونس آیت ۷)

”وہ لوگ کہ جن کے دل میں ہم سے ملنے کی آرزو نہیں ہے۔ جو اپنی اس مادی زندگی میں لگن ہیں اور اس کے بارے میں مطمئن ہیں وہ کہ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔

یہ اہل دنیا کا ذکر ہے جو اسلام کے نزدیک نفرت اور مذمت کرنے کے قابل ہیں۔

قرآن مجید میں رسول کو حکم دیا گیا۔ فَأَعْرِضْ عَنْ
مَنْ تَوَلَّى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (سورہ نمل آیت ۳۰-۲۹)
جو شخص ہماری یاد سے منہ موڑے۔ اے رسول! تم اس کی طرف سے منہ موڑ لو۔ یونہی تمہیں اس شخص سے بھی روگردانی کرنا چاہئے جس کا مطمع نظر اس مادی پست زندگی کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ ان کی سطح ذہنی کی بس یہی آخری حد ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ
وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ (سورہ آل عمران آیت ۱۴)
”مورت، اولاد، سونے، چاندی، اسیل گھوڑوں،

چوپاؤں، کھیتوں سے لگاؤ اور محبت کے جلوے لوگوں کی نگاہوں میں گھپ گئے ہیں۔ یہ تمام چیزیں دنیاوی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ نیک انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

کیا تم لوگ آخرت کے بجائے دنیوی زندگی سے رضامند ہو گئے ہو، دنیا اور آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان آیتوں میں جس بات کی مذمت کی گئی ہے وہ دنیا پر قناعت کر لینا آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کو اپنا مطمع نظر بنالینا ہے۔

ان دو باتوں میں فرق اور بہت بڑا فرق ہے کہ انسان مال و دولت، اولاد، جاہ و حشم، شہرت اور ہر دلچیزی کا طالب ہو اور اس میں کہ وہ ان چیزوں کو انتہائے آرزو اور مقصد اصلی قرار دے۔ جب کہ مقصود یہ ہو کہ انسان کو اس سے روکا جائے کہ اس کے توجہات کا مرکز دنیا اور صرف دنیا ہو۔ اور اس کے پورے ہونے کا ہرگز یہ طریقہ نہیں ہے کہ انسان کے دل سے دنیوی امور کی فطرت کو نکال دیا جائے۔ اس کے میلانات کا سرکچل دیا جائے۔ طبعی قوتوں کا سوتا سکھا ڈالا جائے۔ اصلاح حال کا بہترین اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ انسان کے دوسرے رجحانات کو جھنجھوڑ کر جگا دیا جائے انسان کی فطرت میں جسمانی اور مادی میلانات کے علاوہ کچھ دوسرے میلانات بھی اسی قدرت کے طاقتور ہاتھوں نے قرار دیئے ہیں۔ لیکن ان کے ابھرنے کے لئے تحریک کی ضرورت ہے۔

ہے۔ فرمائیے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا لڑکا پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہو۔ ظاہر ہے کہ لڑکا پہلے کھانے، پینے، کھیلنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سبق، کتاب اور لکھنے پڑھنے کی جانب بعد میں توجہ ہوتی ہے۔ اس کے لئے تحریک کی ضرورت ہے۔ توجہ دہانی، انعام و اکرام قرار دینے کی ضرورت ہے۔ علم دوستی اور کمال طلبی کا جذبہ انسانی فطرت میں موجود ہے لیکن اسے جگانے کی ضرورت ہے۔

یقیناً کوئی سمجھدار باپ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے لڑکے کو کھیل کود سے نفرت ہو جائے۔ اتفاقاً اگر کبھی وہ محسوس کرے کہ اس کا بچہ کبھی کھیلتا نہیں ہے تو شاید وہ پریشان ہو جائے۔ ممکن ہے کہ پہلے خود کہے کہ بیٹا بس پڑھ چکے، اٹھو، چلو پھرو، کھیلو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس سے شکایت کرے کہ ڈاکٹر صاحب اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ ہر وقت پڑھتا لکھتا رہتا ہے اسے کھیلنے کودل ہی نہیں چاہتا ہے۔

اس پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ باپ کو معلوم ہے کہ ایک تندرست بچہ وہ ہے جو پابندی سے اسکول جانے اور پڑھنے لکھنے کے ساتھ کھیلے بھی، گھومے پھرے بھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ جب اپنے لڑکے پر ناراض ہوتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ اس کے لڑکے کو صرف کھیلنے سے سروکار ہو۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی مطلب نہ ہو۔

مذہبی تعلیمات انسان کے بلند شعور کو جگانے کے لئے ہیں۔ یہ شعور فطرت انسانی کے اندر موجود ہے۔ لیکن چونکہ وہ اونچا ہے۔ اس کا سرچشمہ انسانیت کا بلند تر پہلو ہے۔ لہذا وہ دیر میں جاگتا ہے۔ اسے بیدار یا زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شعور معنویات کا شعور ہے۔ یہ شعور روحیات کا شعور ہے۔ چونکہ ہر میدان کا سرچشمہ روح انسانی ہے اس لئے اسلام یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ان مادی اور محسوس چشموں کو خشک کر دے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے چشموں کو بھی بہنے کا موقع دیا جائے جن کی انسانی فطرت امانتدار ہے۔ وہ چشمے معنویات کے چشمے ہیں۔

اسلام اور قرآن ہرگز ہرگز اس کا درپے نہیں ہے کہ خلقت انسانی میں خدا کے دست قدرت و حکمت نے جو مادی طاقتیں رکھ دی ہیں انھیں معطل بنا دیا جائے۔ بلکہ اسلام اور قرآن کی کوشش یہ ہے کہ انسان کی ان معنوی قوتوں کو نمایاں کیا جائے جو بغیر ابھارے خود سے عام طور پر ابھرا نہیں کرتی ہیں۔

اس مطلب کی وضاحت کے لئے مناسب ہے کہ ایک مثال پیش کر دی جائے۔

فرض کیجئے کہ کسی شخص کا ایک لڑکا ہے، وہ اسے اسکول بھیجتا ہے۔ باپ جب دیکھتا ہے کہ اس کے لڑکے کو صرف کھانے پینے، کھیلنے سے مطلب ہے تو اسے رنج ہوتا ہے۔ وہ اپنے لڑکے پر خفا ہوتا ہے اسے سرزنش کرتا

اسلام اور قرآن کا انسان اور جہان کے متعلق ایک مخصوص نقطہ نظر ہے۔ وہ انسان کو روکتا اور پوری قوت سے روکتا ہے کہ اس کی پوری توجہ کا مرکز صرف دنیا اور اس کی مادی چیزیں ہوں۔

وہ زندگی کو اسی دنیوی مادی زندگی میں محدود نہیں سمجھتا۔ وہ اس دنیوی زندگی کی قدر و قیمت کا قائل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ وسیع اور ایک عظیم دوسری زندگی کا بھی انسان کو پیغام دیتا ہے۔ یہ دنیوی زندگی اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ یہ فانی ہے وہ باقی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دنیا کو بھی اس دنیا میں محدود نہیں سمجھتا ہے۔ عالم آخرت بھی موجود ہے۔

اس دنیا کی نسبت عظمت و وسعت کے اعتبار سے اس عالم آخرت سے اتنی بھی نہیں ہے جو رائی کے دانہ کی نسبت کوہ ہمالیہ سے۔ اسلام اور قرآن کے انسان اور جہان کے بارے میں اس نقطہ نظر کا نتیجہ صاف ہے۔ بے شک انسان اس درخت دنیا کا ایک پھل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اور زندگی کا دامن دنیا کے حدود سے نکل کر عالم آخرت تک پھیلا ہوا ہے۔ جب کہ انسان کو موجودات عالم کے درمیان یہ اہمیت حاصل ہے تو ہرگز اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ دنیا اور اس کے مٹ جانے والی چیزوں کو اپنا آخری مقصد قرار دے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں:

«لَيْسَ الْمُتَجَرُّ أَنْ تَرَى الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَرًا»

”یہ کوئی سودمند اور فائدہ بخش تجارت نہ ہوئی کہ اے انسان تو اپنے بیش بہا نفس کی قیمت اس فانی دنیا کو قرار دے لے۔“ جس طرح فلسفہ قرآنی ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم دنیا اور اس کے موجودات سے بدظن ہوں، انھیں برا اور مذموم سمجھیں۔ کیونکہ وہ معرفت خدا کا ذریعہ ہیں۔ وہ اس کے علم و حکمت کی نشانیاں ہیں، وہ قابلِ مذمت نہیں قابلِ مدح ہیں۔ اسی طرح وہی فلسفہ قرآن ہدایت کرتا ہے کہ انسان کی آرزوؤں کا مرکز دنیا اور اس کی مادی چیزوں سے بالاتر ہونا چاہئے۔



(بقیہ صفحہ نمبر ۲۷۷ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

آج جب کہ دنیا خوفناک عالمگیر آتش جنگ سے
سہمی ہوئی ہے..... امن و سلامتی برقرار رہنے کے لئے
ضرورت ہے کہ مسلمان اسلام کی آواز۔

”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا“
(سورہ آل عمران آیت ۱۰۳)

پرسنٹ کر ایک جھنڈے کے نیچے آجائیں اس
تیسری قوت کے وجود میں آجانے کے بعد امریکہ اور
روس کے درمیان تصادم کا امکان کم ہو جائے گا۔ یہ
خیال خام ہے کہ دنیا کو اب اسلام کی ضرورت نہیں
ہے۔ بشریت اپنے حال و مستقبل میں اسلام کی اسی
طرح محتاج ہے جس طرح ماضی میں تھی۔



یثرب کا مسافر سرزمین کربلا پر

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

سرمہ اور بدن ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے لیکن یہی مصیبتیں اُسے دبا دبا کر اس کے عزم و ارادہ میں وہ کچک پیدا کر دیتی ہیں کہ دب دب کر اُبھرنا اور کچل کچل کے سر بلند ہونا اس کی خودداری کا تقاضا اور شرافت نفسانی کا مقتضا بن جاتا ہے یہاں تک کہ ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی حدیں مل جاتی ہیں مگر مظلومیت، صبر اور قوت برداشت کی سرحد کا نشان تک نہیں ملتا۔ بلند مقاصد کی جستجو ہی انسان کو سیلابوں کے مقابلہ اور حوادث و انقلابات کے طوفانوں سے برسرِ جنگ ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ کمزور، ضعیف البنیان، ناتواں انسان میں کہاں بھلا اتنی تاب تھی کہ وہ سمندروں کو اسی سینہ سے ریلتا ہوا اور پہاڑوں کا اسی دل و جگر سے مقابلہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن ارادے کی مضبوطی، عزم کا استحکام وہ تھا جس نے ذرہ کو آفتاب سے اور سنگ ریزہ کو سر بفلک پہاڑ سے ٹکرا دیا۔

حسینؑ وہ حسینؑ جن کے مقاصد کے نورانی تار خالق کے خزانہ مشیت سے لئے ہوئے تھے جن کی نظر ایک اور صرف ایک خدا کی مرضیوں پر جمی ہوئی تھی جو اپنے مقاصد کے لئے نہیں الوہی مقاصد کو زندہ کرنے کے لئے کمر بستہ و آمادہ ہوئے تھے۔ جو دل میں یہ جذبہ لے کر

ارادوں میں پختگی اور عزائم میں استحکام، مقصد اور اصول کی بلندی کے لحاظ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ مقاصد جتنے بلند ہوں گے انسان کا قدم ان کے حصول میں اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھے گا مستقبل کی روشنی عہد آئندہ کا چمکتا ہوا پر امید آفتاب ماضی اور حال کی موجودہ اور گزری ہوئی تمام پیش نظر تاریکیوں کو اسی طرح چھانٹ دیتا ہے جیسے شب کے دھندلکے کے بعد سپیدہ سحر کا نورانی اور ضیا بار جلوہ مصائب اور آلام کے گرجتے ہوئے بادل ہمیشہ ان ہی سروں پر منڈلاتے رہے ہیں جن میں حصول مقصد اور منزل تک پہنچنے کی دھن سما چکی تھی۔ یقیناً مصیبتوں کی چمکتی ہوئی بجلیوں نے، رنج و غم کی برستی ہوئی کالی گھٹاؤں نے، تلاش منزل کرنے والوں اور سراغ لگانے والوں کو ضرور بالضرور لرزہ بر اندام کر دیا ہوگا مگر مضبوط اور پُر عزم دل کے حوصلوں کو نہ کبھی دہلایا جاسکا۔ اور نہ ان پر رعب و داب کا سکہ جمایا جاسکا قدم لرز سکتے ہیں، بدن کا نپ سکتا ہے، ہاتھ تھرا سکتے ہیں مگر بلند مقصد کا جو یاد دل ہر گز مرعوب نہیں ہو سکتا۔

تکلیفوں، رنجوں اور غموں کے پہاڑ ایسے انسان پر گرتے ہیں اُسے کچلتے ہیں یقیناً وہ کچل جاتا ہے۔ جسم

اُٹھے تھے کہ تو سہمی، بندہ وہی بندہ جو دنیا کو بھولے ہوئے خدا کی یاد پھر دلادے بناؤ جو ان بلند مقاصد کو لے کر اٹھا ہو کیا اس کے سینے میں ہمالیہ ایسا دل نہ ہوگا جو ان اونچے مقصدوں کا علمبردار ہو اس کا عزم و ارادہ جبالِ راسیات سے باتیں نہ کر رہا ہوگا اس کی پشت پر طاقتور خالق کا دست قدرت نہ ہوگا۔ یقیناً حسینؑ کے سامنے اگر اپنے مقاصد کے سلسلہ میں سیلابِ مصائب تھا تو ان کے پہلو میں پہاڑ ایسا بلند اور مستحکم دل بھی تھا۔

وہ تمام مظالم کو تمام مصیبتوں کو صرف ایک سپر پر روک رہے تھے اور وہ ”جذبہ نصرت حق“ یہ آواز حقانیت پر لبیک وہ تھی جس نے عالم کے دلوں کو ہمیشہ دہلایا اور آج بھی دہلا رہی ہے۔ اسلام کی *هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنِي* کی صدا حسینؑ ایسے دل و دماغ رکھنے والے کے لئے بڑی جگر خراش اور تکلیف دہ تھی۔ انھوں نے طے کر لیا کہ میری زندگی کا صرف ایک ماحصل اور مقصد ہے اور وہ حق کی نصرت، اچھا چاہے مجھے وطن کو چھوڑنا پڑے لیکن اسلام کو بے گھر نہ ہونے دوں گا، نانا کی قبر ماں کی لحد بھائی کا مزار سب کے چراغ میرے نہ ہونے سے بجھتے ہیں تو بجھ جائیں، مگر شمعِ حرم کو خاموش نہ ہونے دوں گا..... واللہ حسینؑ نے جو کہا وہ کر کے دکھا دیا۔

مکہ میں جا کر پناہ لینا اور وہاں پناہ نہ ملنا۔ زندگی کے آخری جج کی تمنا اور جج نہ کر سکا عمرہ سے بدل کر مکہ کو چھوڑ دینا۔ یہ وہ مصائب تھے جو حسینؑ نے ہنسی خوشی

برداشت کئے کس بنا پر، صرف اپنے بلند مقصد کی امداد اور سہارے پر۔ رسولؐ کا نواسہ مدینہ سے ہجرت کر چکا، حسینؑ راستہ طے کر رہے ہیں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے۔ دنیا مصیبتیں جھیلی ہے، تکلیفیں اٹھاتی ہے زندہ رہنے کے لئے مگر حسینؑ مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ مرجانے کے لئے، لوگ منزلیں طے کرتے ہیں صعوبات سفر برداشت کرتے ہیں زندگی کے قائم رکھنے کے لئے اور حسینؑ سفر کر رہے ہیں مسافتیں طے کر رہے ہیں کاروانِ حیات کو موت کی منزل تک پہنچانے کے لئے۔ لیجئے حسینؑ کا سفر تمام ہوا مسافر منزل پر پہنچ گیا۔ مقصد کے فراق میں سرگرداں نقطہ مقصد پر آ گیا۔ خود نہیں کسی کا لایا ہوا اثرب سے چلا ہوا مسافر، مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کو چھوڑ کر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا وہاں پہنچا جہاں کا وعدہ ازل سے ہو چکا تھا۔ آج محمدؐ کا نواسا عالم ازل سے انتظار کرتے کرتے اپنی اسی وعدہ گاہ پر آ ہی گیا، حسینؑ کو خوشی ہوگی، دل شاد و فرحاں ہوگا کہ الحمد للہ اس منزل پر کاروان سفر ٹھوکریں کھاتے کھاتے پہنچ گیا، جس کا مجھ ہی کو نہیں میرے نانا محمد مصطفیٰ ﷺ اور بابا علی مرتضیٰ کو مجھ سے پہلے انتظار رہ چکا تھا۔

کر بلا کا فاتح زمین کر بلا پر اُترا۔ کہا جاتا ہے کہ امام کا وفادار گھوڑا چلتے چلتے یکبارگی رُک گیا امام کو توجہ ہوئی اصحاب سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ اس مقام کا کیا نام ہے۔ کسی کہنے والے نے کہہ دیا کہ اس زمین کو کر بلا

بھی کہتے ہیں۔ حسینؑ کے لئے یہ آواز کوئی نامانوس آواز نہ تھی۔ وہ ابتدائے آفرینش سے کربلا کا نام سنتے رہے تھے ماں کی آغوش، باپ کی آغوش اور نانا کی آغوش میں رہ کر بھی انتظار اسی گود کا تھا، جہاں حسینؑ اپنے کو پارہے تھے۔ ارض کربلا پر قدم رکھتے ہی امام حسینؑ نے فرمایا کہ واللہ یہی وہ زمین ہے جہاں ہمارے خون بہائے جائیں گے، جہاں ہماری عزت و حرمت کو برباد اور تباہ کیا جائے گا۔ گویا امام ان الفاظ کے واسطے سے اپنے اصحاب، اعوان و انصار کے دلوں کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا چاہتے تھے کیا کہنا ان وفادار ثابت قدم اور پرجگہ اصحاب کا حسینؑ کے یہ الفاظ ان کے عزائم اور ارادوں کے لئے مدد و معاون اور سہارا ثابت ہوئے۔ یاد رہے کہ مصیبتیں آجانے کے بعد، بھنور میں پھنس جانے کے بعد، سیلاب کی زد پر آچکنے کے بعد، شیر کے پنجہ میں گرفتار ہو جانے کے بعد، جان گنونا اور اُف نہ کرنا اور ہے لیکن پہلے سے ہلاکت کے یقین کے بعد موت کا منہ دیکھ لینے کے بعد موت کے تخیل کی تصدیق امام کی زبانی ہو چکنے کے بعد، فنا کے آغوش میں ہنستے، کھیلتے اور مسکراتے جانا اصحاب حسینؑ کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

موت کی بجلی چمکے اور آنکھیں نہ جھپکیں، بڑتی رہیں، فنا کے بادل گر جائیں، بدن نہ کانپے ثبات اور بڑھتا جائے۔ مصائب کا سیلاب بڑھے شناور نہ ڈوبے اور ابھرتا جائے۔ یہ مرقع یہ منظر اور کہاں ہے بس کربلا کے دامن

میں اصحاب حسینی کی روشن سیرتوں میں۔
اچھا حسینؑ اترے خیمے نصب کرنے کا حکم دیا۔
وہ عرب کی دھوپ، وہ آفتاب کی تمازت، وہ گرمی کی شدت وہ جلجتی ہوئی زمین، وہ تپتا ہوا جنگل اور حسینؑ کے خیموں کا فرات کے کنارے سے ہٹ کر کربلا کی گرم ریتی پر لگایا جانا۔ حسینؑ کے ساتھ بچوں اور سردخون کے بوڑھوں کے علاوہ گرم جوش حوصلہ مند باہمت جوان بھی تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ اصحاب حسینی کی اطاعت کی کوئی ایک زبان وہ نہ تھی جو امام کے حکم سے سرتابی کرتی ہوئی نظر آتی، خیر یہ بھی وقت آیا اور گزر گیا۔

زمانہ تیزی سے گزر رہا ہے لیکن حسینؑ ہر گزرتے ہوئے لمحے کو اپنی معصومیت کا گواہ بنا بنا کر رخصت کر رہے ہیں۔ صلح کی گفتگوئیں جاری ہیں ہر امکانی کوشش امن و سلامتی کی جاری ہے۔ ہوگا وہی جس کی خبر حسینؑ پہلے دے چکے ہیں۔ مگر فریب و سیاست کے جالوں کا ہر ہر تار حیلہ سازی اور عذر تراشی کا ہر ہر موقع کیوں نہ قطع کر دیا جائے، ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت کی سرخی کیوں نہ اتنی نمایاں ہو جائے کہ فلک پر شفق بن کے ظاہر ہو۔ امام حسینؑ چاہتے تھے کہ میں حق کو باطل اور باطل کو حق سے اس طرح الگ کر دوں کہ ہر کور باطن اور دل کے اندھے متعصب کو بھی گنجائش چون و چرا باقی نہ رہے۔ لیکن ادھر امام حسینؑ کی وہ صلح جو یا نہ کوشش اور دشمن پر اتمام حجت کی آخری منزلیں اور ادھر طاقت

وقت پر گھمنڈ، ظلم و ستم، جبر و تشدد پر غرور، حکومت کا نشہ، دولت و سلطنت کی سرمستی، جاہ و جلال، مال و منال، فوج و لشکر پر ناز، اپنی فتح کا یقین، یہ وہ چیزیں تھیں کہ امام حسینؑ صلح و آشتی اور قیام امن کی پیش کشیں اور درخواستیں کرتے رہے اور اس کے جواب میں انکار پر انکار تر دید پر تر دید ہوتی رہی۔ ظالم کو کیا معلوم تھا کہ میرے ظلم و تشدد کی پونجی سے کہیں زیادہ مد مقابل کی مظلومیت کا سرمایہ ہے، وہ ظاہر بین نگاہیں کیا جانیں کہ حسینؑ کے دل میں عزم کی کتنی گہرائیاں ہیں ان کے استقلال و ثبات کی کیا منزل ہے۔ وہ ظلم سے حق کو دبانا چاہتا ہے۔ حسینؑ مظلومیت سے حق کو ابھارنا چاہتے تھے۔

ساتویں محرم آئی اور چھوٹے چھوٹے بچوں پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔ العطش العطش کے جگر خراش نعرے بلند ہوئے، لیکن قربان ہوں ہماری جانیں ان بچوں سے لے کر ان بوڑھوں اور پھر پردہ دار عورتوں پر جن کے عزم و ارادہ میں فرق کیسا۔ بلکہ استحکام اور ثابت قدمی اور بڑھتی گئی۔ لمحات زمانہ گذرتے گذرتے اور انتظار کی گھڑیاں کٹتے ہوئے عاشور کی رات اپنے خوفناک و مصیبت ناک پیکر میں اضطراب و بے چینی کی دنیا اپنے ساتھ لے کر آئی۔ یوں تو بہت سی راتیں آئیں اور گذر گئیں مگر کربلا کی سرزمین پر شب عاشور جن خصوصیات کو اپنے دامن میں لے کر آئی وہ نہ اس سے پہلے نظر آتے ہیں اور نہ اس کے بعد دنیا میں ایسے مواقع حاصل کئے

گئے ہوں گے۔ مہلتیں لی گئیں ہوں گی لیکن فوجوں کو بڑھانے کے لئے، لشکروں میں اضافہ کے واسطے، تلواروں پر صیقل اور نیزوں کو تیز کرنے کی غرض سے۔ مگر کربلا کی یہ انوکھی رات کی مہلت، جو امام حسینؑ نے اپنے بھائی عباسؑ کو بھیج کر بہ کوشش حاصل کی کچھ عجیب و غریب مقاصد کی بنا پر حاصل کی گئی تھی وہ تکسیروں کی بلند ہوتی ہوئی صدائیں وہ تلاوت قرآن کی بڑھتی ہوئی آوازیں، وہ محراب عبادت میں شمشیر آبدار کی خمیدگی کے منظر وہ رکوع و سجود اور نمازوں میں بیچ و خم کے ساتھ جہاد کے ولولوں اور حوصلوں میں اضافے، وفاداری، ایفائے عہد، اپنی بات پر آخر دم تک قائم رہنے کی یقین دہانیاں نصرت حق کے واسطے وہ آپس میں باہم قسمیں اور حلف برداریاں، یہی تذکرے، یہی چرچے، یہی عبادتیں، یہی تلاوتیں، ہر طرف ہر گوشے میں گویا یہ ایک طرف اللہ کی تسبیح خوانی کر رہے تھے اور دوسری طرف کربلا کی خاک کے ذرے ان کی تسبیحوں اور عبادتوں کو دیکھ کر ان کے ثنا گستر و تسبیح خواں بنے ہوئے تھے۔

چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی، فضا کے کائنات کا سناٹا، نہر فرات کی خاموش موجیں، تھما ہوا پانی، رُک رُک کے دبے پاؤں چلتی ہوئی ہوائیں ان عبادت گزاروں کی زیارتیں کر رہی تھیں، عاشور کی شب یوں ہی بسر ہوئی آج کے نکلتے ہوئے آفتاب کا رنگ ہی اور تھا۔ زرد چہرہ، تھر تھرائی ہوئی کرنیں، شرمائی ہوئی نگاہیں گویا کہ

ایک سوگوار کسی کے غم میں عزادار تھا، بال بکھرے ہوئے
چہرے پہ خاک کر بلا کا غازہ ملے ہوئے۔ اچھائیوں
گریباں چاک صبح عاشور نمودار ہوئی۔

یہ صبح اس دن کی اس شام کی پیغامبر ہے جب دنیا سے آفتاب امامت غروب ہو چکے گا شمع حرم خاموش اور چراغ مدینہ گل ہو جائے گا دن چڑھتے چڑھتے فوجیں آمادہٴ پیکار ہو چکیں، لشکر صف بستہ میمنہ اور میسرہ کی ترتیب ہو چکی ایک مظلوم سید، فرزند رسولؐ کو قتل کرنے کو ہزاروں اور لاکھوں خونخوار آمادہ و کمر بستہ ہو گئے لیکن اس عبرتناک موقع پر بھی حسینؑ اور انصار حسینؑ کا ثبات و استقلال دیکھنے کے قابل ہے۔ کسی پیشانی پر شکن نہیں، چہرہ پر آثارِ حزن و ملال کا ظہور نہیں، گویا موت ان کی سمجھی بوجھی ہوئی پہچانی ہوئی ہے جس سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔

جنگ چھڑی، خون کے دریا امنڈنا شروع ہو گئے۔ حسینؑ کے اصحاب و اعزا ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ بچپنے کے دوست حبیب ابن مظاہرؓ گئے، زہیر قین، مسلم ابن عوسجہ رخصت ہوئے، اعزا کی باری آئی، عقیلؓ و جعفرؓ کی اولاد کام آئی، لیکن مصائب کے اضافے کے ساتھ حسینؑ کے چہرے پر سرخی بڑھتی جاتی ہے۔ نورانیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اکبر میدان میں آئے، تلواریں اور برچھیاں کھائیں،
باپ کو داغ جدائی دیا۔ عباسؑ بھی رخصت ہوئے دریا پہ

بازو کٹے، سر پر گرز گراں پڑا مگر حسینؑ کے ہاتھ سے
صبر و استقلال کا دامن نہ چھوٹا، آخر میں حرمِ لہ کے تیرسہ شعبہ
نے معصوم شہماہ علی اصغرؑ کے گلے کو بھی چھیدا اور بچے کا
کام حسینؑ کے ہاتھوں پر تمام کر دیا۔ انسانیت کے ہاتھ
پیروں میں لرزہ پڑ گیا مگر حسینؑ کے نہ ہاتھ کانپے اور نہ پیر
تھر تھرائے۔

کائنات کے ذرے ذرے سے نوحہ و ماتم کی صدائیں بلند ہوئیں مگر حسینؑ کے پائے استقلال نہ ڈمگائے۔ اب بس ایک مرحلہ رہ گیا تھا جو حسینؑ کے واسطے پہلے ہی سے آسان تھا، مگر صبر و تحمل کے جوہر کیونکر کھلتے، اگر پہلے ہی میدان جہاد میں آ کر حسینؑ اپنی جان دے دیتے۔ ہوگا یہی۔ مگر ابھی ذرا میدان جنگ کو جمل و صفین کا آئینہ دار بن جانے دو۔ حمزہؑ و جعفرؑ کی بھولی بھوئی شجاعت کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو جانے دو۔ علیؑ کی تلوار کے جوہر آخری بار دنیا کے سامنے پھر آ جانے دو۔

جنگ کی اور تاریخ شجاعت کو الٹ کر صفحات عالم
سے بہادران روزگار کے نقوش شجاعت مٹا کر اس منزل
پر پہنچے جس کے وہ منتظر تھے۔

آخر نیزوں اور تلواروں، تیروں اور سنانوں میں
مظلوم کا خون تقسیم ہوا۔ شمر ملعون کے کندخجر نے انسانیت
کے جسم و جان کے باہمی ارتباط کو منقطع کیا۔ حسینؑ شہید
ہوئے اور قافلہ بہ عزم و ارادہ اپنی آخری منزل پر پہنچا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۷ پر۔۔۔۔۔)

ایام عزاکا اختتام

اور اپنے نفوس کا جائزہ

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی طاب ثراہ

ہے۔ ابتدائے آفرینش میں بھی ان کی صف ماتم بچھی، آج بھی ان کی عزاقائم ہے اور مستقبل بھی درخشاں نظر آ رہا ہے مگر کیا امام حسینؑ کی عزائے اُن پر صرف چار آنسو بہا لینا، ہائے واویلا مچا لینا ہے؟ نہیں، نہیں، ایسا نہیں۔ عزاداری کا اصل مقصد یہ ہے کہ جس راستے میں انھوں نے جان دی، جس مقصد کی خاطر انھوں نے اپنا گھر بار لٹا دیا اور جس راہ میں انھوں نے ظاہری عزت و آبرو تک کو عزیز نہ کیا، اس راستے کو ہم سمجھیں اور چلتے رہنے کی کوشش کریں، ان کے مقصد کو جانیں اور عملاً اس کے محافظ ہوں اگر ایسا ہے تو عزادار حسینؑ ہیں۔ ورنہ صورت سے ہیں اپنی سیرت سے نہیں۔

معرکہ کربلا کا فاتح حسینؑ دنیا کو انسانیت کی صحیح قدرو قیمت بتانے کے لئے اٹھا تھا، اس کا مقصد انسانیت اور اس کی شرافت و فضیلت کو حیوانیت و بہیمیت کے شکنجوں سے آزاد کرانا تھا۔ وہ دنیا کے واسطے حق و صداقت کے پیغامبر تھے۔ ان کی زندگی آزادی و حریت کے ساتھ عبودیت الہی کا ایک سانچا تھی جس میں ہر صاحب بصیرت اپنی سیرت کو ڈھال سکتا ہے، ان کا کردار عالم انسانیت کے لئے ایک بلند معیار تھا، جس

یوں تو اس نیلگوں فلک کے نیچے ہزاروں بے گناہوں کے خون بہے اور بہتے رہیں گے۔ دنیا ہزاروں انقلابات کی جولان گاہ بنی اور بنتی رہے گی۔ زمین لاکھوں انسانوں کے خون سے لالہ زار ہوئی اور ہوتی رہے گی، مگر یاد رکھئے کسی خون کی رنگینی پائیدار ثابت نہ ہو سکی۔ یقیناً انقلابات نے آکر دنیا کے دل میں اختلاف پیدا کیا مگر کچھ عرصہ کے بعد سکون ہو گیا۔ اس بزم کائنات میں ہزاروں انسانوں کی صف ماتم بچھی مگر پھر اٹھ گئی کسی حادثہ کا اثر دائمی نہ بن سکا لیکن نہ معلوم کربلا کی داستان میں، نینوا کے درد انگیز قصہ میں کون سا درد بھرا ہوا ہے جس کا اثر ہر دل میں اور جس کا تصور آج بھی ہر دماغ میں ہے۔ آخر اس میں راز کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خون زیادہ بہا ہے، آدمی زیادہ مارے گئے ہیں، مال و اسباب کثرت سے لوٹا گیا ہے مگر دل کے پاک اور عزیز ترین جذبات کی قربانی اتنے اثر انگیز اور نتیجہ خیز طور پر کہیں پیش نہیں ہوئی جیسی کربلا کی زمین پر رسولؐ کے نواسے نے پیش کی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کے انسانوں کی سوغواری ہوئی مگر چند روزہ رہی لیکن حسینؑ مظلوم کی سوغواری زمان و مکان کی قیدوں سے آزاد

کسوٹی پر کس کر انسان کے افعال و اعمال معراج کمال پر پہنچ سکتے ہیں۔ وہ علمبرادران صداقت کی ہمتِ دل، جوشِ عمل، جرأتِ اخلاق کے واسطے منارہٴ ہدایت ہیں۔ گویا یوں سمجھئے کہ حسینؑ نام ہے حریتِ ضمیر کا، حسینؑ نام ہے باطلِ اقتدار سے بغاوت کا۔ یہ وہ بلند اوصاف ہیں جو امام حسینؑ کی ذات سے وابستہ ہو گئے اور ان کی ہستی ان سے وابستہ ہو گئی۔ وہ، وہ حریت پسند تھے جن کے نام کی یاد آزادی کی آواز کے ساتھ ہے۔ وہ، وہ حق پرور تھے جنہوں نے حقانیت کی آواز سے آواز ملائی اور حقانیت ہمیشہ کے لئے ان کی ہم نوا ہو گئی۔ حسینؑ وہ تھے جنہوں نے یزیدی عہد میں نہیں بلکہ شیطانی و ابلیسی عہد میں کمر خمیدہ اسلام کو سیدھا کر کے اپنے بعد آنے والے داعیانِ حق کے دلوں میں یہ جرأت و ہمت پیدا کر دی کہ وہ فاسق و فاجر، جبار و قہار بادشاہوں کے مقابلہ میں جم کر اور ان سے نہ مرعوب ہو کر ایمان و اسلام کی ”ھَلْ صَاحِبِ نَاصِرٍ یَنْصُرُنَا“ کی آواز پر لبیک کہہ سکیں۔ ورنہ یاد رکھئے کہ اگر ۱۶ھ میں باطل کے مقابلہ میں یہ حق کی آواز دھیمی ہو جاتی تو قیامت تک کے لئے حق، باطل کے سامنے، شرافت، رذالت کے سامنے، انسانیت، حیوانیت کے سامنے اور کہنے دیجئے کہ الوہیت شیطنت کے سامنے بظاہر جھک جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لاچاری اور لاواری کے زمانہ میں اگر حق و صداقت، شرافت و حریت اور انسانیت والوہیت نے کسی کے دامن میں پناہ لی ہے تو وہ حسینؑ تھے۔ یہ تھا وہ حسینؑ جس

نے اللہ کے باقی مقصد میں جان نثار کر کے فنا کا لباس اُتار اور بقا کی قبا پہنی۔ اب بھلا ممکن تھا کہ حسینؑ کی یاد دنیا سے مٹ جائے؟ نہیں، حسینؑ کے ذکر سے اللہ کی یاد تازہ ہے۔ یہ تھے وہ حسینؑ جن کی طرف آج ہم اپنے کو منسوب کرتے ہیں اور ان کے جاں نثار، فداکار اور شیدائی ہونے کے دعویدار ہیں مگر یاد رکھئے، محبت کی کسوٹی اطاعت ہے اگر الفت شعاری کے ساتھ ساتھ اطاعت شعاری بھی ہے تو جانے کہ حقِ محبت ادا ہوا، ورنہ زبانی دعوائے محبت کرنے والے بہت ہیں۔ یہ ایام عزاکا دور ہمارے لئے ایک تازیانہ عمل تھا۔ الفت کا تقاضا کہ اگر ایک طرف ہماری آنکھیں غم میں اشک فشاں تھیں تو دوسری طرف دل میں بھی رنج و ملال کی فضا قائم ہوتی۔ اگر ماتم میں ہمارے سینوں پر ہاتھ پڑتے تو اس تصور کے ساتھ کہ آج یہ ماتم کی آواز ہے اگر موقع آیا تو ان ہی ہاتھوں سے تلواروں کی جھنکار کی صدا پیدا ہوگی۔ ہم اگر سیاہ پوش تھے تو اس یقین کے ساتھ ہوتے کہ تو سہی دنیا کو اس غم میں سیاہ پوش بنا کے رہیں۔ یقیناً ہمارے گھروں میں صف ماتم بچھی لیکن حق جب ادا ہوتا کہ اس کے ساتھ دل بھی ماتم کدے بنے ہوتے۔ عزا میں تاثیر جب ہوتی کہ نوحہ و شیون کی آوازیں درودیوار سے نہ ٹکراتیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتیں۔ پھر ہم اس قابل تھے کہ حسینؑ کا پُرساں کی ماں فاطمہ زہراءؑ کو دیتے۔ عزا کے دن ختم ہوئے۔ حسینؑ کے ماننے والو! اب تم ذرا خود ہی تنہائی میں بیٹھ کر سوچو کہ تم کس قدر اس



نور ہدایت فاؤنڈیشن

مصلح ملت، محی الدین آیۃ اللہ العظمیٰ حضرت غفران مآب مولانا سید ولد ارعلیٰ کی یاد و تاسی میں قائم ادارہ نور ہدایت فاؤنڈیشن آج اپنی تاسیس کے پندرہویں سال میں ہے۔ اس مختصر مدت میں اس نے اپنی منفرد و مفید سرگرمیوں کی بنا پر اپنی ممتاز و قابل رشک شناخت بنالی ہے۔ بحمد اللہ یہ روز افزوں ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ فعالیت، افادیت اور کامیابی اس کی مترادف ہو گئی ہیں۔

نور ہدایت فاؤنڈیشن ادارہ سے زیادہ مشن کی صورت میں فعال ہے جو حضرت غفران مآب کے مشن کی توسیع کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا محور ہندوستان کی میراث اسلامی کا احیاء ہے جس کے ضمن میں اس کے مندرجہ ذیل شعبے سرگرم ہیں:

(۱) ریسرچ سنٹر (۲) عمدۃ العلماء کتب خانہ (۳) رحمت مآب دارالمطالعہ (۴) ہندوستانی شیعہ انسائیکلو پیڈیا (۵) تحفظ میراث علمی۔ کتب و مسودات کی ڈیجیٹل صورت میں منتقلی (۶) عماد الاسلام بک ڈپو (۷) مدرسۃ الزہرہ۔ دینی تعلیم گاہ برائے خواتین (۸) نشر و اشاعت کتب برائے افادہ عامہ مزید برآں فاؤنڈیشن کا پرنٹ میڈیا کا شعبہ: مندرجہ ذیل اخبار و رسائل کی اشاعت سے دنیا کے صحافت پر اپنا نقش بنا چکا ہے:

۱۔ اردو روزنامہ ”نقیب“ لکھنؤ ۲۔ ہندی روزنامہ ”راشٹریہ آسرا“ لکھنؤ ۳۔ اردو ہفت روزہ ”واعظ“ لکھنؤ ۴۔ ہندی ہفت روزہ ”دائرہ“ لکھنؤ ۵۔ اردو۔ ہندی ماہنامہ ”شعاع عمل“

الکٹر انک اشاعت میں فاؤنڈیشن ان ویب سائٹوں کو چلا رہا ہے:

۱۔ نور ہدایت فاؤنڈیشن۔ (www.noorehidayatfoundation.org)

۲۔ نقیب لکھنؤ۔ (www.naqeeblucknow.com)

سوشل میڈیا میں فیس بک پر نور ہدایت فاؤنڈیشن

(<https://www.facebook.com/noorehidayatfoundationIndia/>)

اور نقیب (<https://www.facebook.com/urdu-naqeeb/>) کے نام سے فاؤنڈیشن اپنی موجودگی، زندگی اور تازگی رقم کر رہا ہے۔ اپنے محدود وسائل سے فاؤنڈیشن فلاح عامہ کے میدان میں بھی قابل قدر اقدامات کر رہا ہے۔ ان میں غریب و پسماندہ طبقہ کے افراد قوم و ملت کی امداد اور معالجاتی تعاون شامل ہیں۔ یہ بھی ہماری خوش نصیبی ہے کہ فاؤنڈیشن کو لائق و فعال افراد کی ٹیم میسر ہو گئی جس کی بدولت فاؤنڈیشن کے خوابوں کو خوب سے خوب تر تعبیریں ملتی ہیں۔ اس کے سکریٹری مولانا سید مصطفیٰ حسین صاحب نقوی اسیف جاسی اپنی فعالیت سے ہماری نیک اختر کی علامت ہیں۔

ہر خاص و عام سے ہماری عام اپیل ہے کہ فاؤنڈیشن کے شعبوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں، ان کی دامے درمے سخی معاونت کریں، اور علمی، قلمی، اخلاقی شرکت و ہمنوائی کریں۔ ہمیں آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیدتانی، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای اور دیگر مراجع کرام سے سہم امام لینے کی اجازت حاصل ہے۔

آخر میں لیکن اہم بات: خداوند کریم و منان کی بارگاہ میں عاجزانہ دعا ہے کہ وہ فاؤنڈیشن کے مساعی کو قبولیت کا شرف بخشے اور ہماری نیک توفیقات میں اضافہ کرتا رہے۔

سید کلب جواد نقوی (امام جمعہ لکھنؤ)

صدر و بانی نور ہدایت فاؤنڈیشن، لکھنؤ